مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے　　فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　　ہوائی ڈاک پچیس[۲۵] پونڈ یا چالیس[۴۰] ڈالر

بحری ڈاک نو[۹] پونڈ یا چودہ[۱۴] ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:　حافظ محمد یحییٰ، شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج اسٹریچن روڈ، کراچی۔

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۵　　ماہ محرم الحرام وصفر المظفر ۱۴۲۵ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۰۵ء　　عدد ۳

فہرست مضامین

ای میل: email : shibli academy @ rediffmail. com

☆☆☆

شذرات

اس مہینے میں عین عاشورا کے روز لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد ہو گیا، دونوں فرقوں کے تصادم میں تین آدمی لقمہ اجل ہو گئے اور دو درجن سے زیادہ زخمی ہو گئے، ۵۰ دکانیں تباہ اور ایک درجن مکان نذر آتش کر دیے گئے، دنیا بھر اور خود اس ملک میں مسلمان دہشت گری اور تشدد کے لیے بدنام ہیں، ہندوستان میں آئے دن ہونے والے جن فسادات میں سیکڑوں اور ہزاروں مسلمان تہہ تیغ کر دیے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کا آغاز ان ہی کی جانب سے ہوتا ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو جب لڑنے کے لیے دوسرے نہیں ملتے تو وہ آپس ہی میں ٹکرانے لگتے ہیں، اس کے ثبوت میں ہندوستان، پاکستان اور اسلامی ملکوں میں ہونے والے باہمی تصادم کو مثالاً پیش کیا جاتا ہے، جن میں قتل و خوں ریزی ہی نہیں مسجدوں میں بھی وحشت اور درندگی کا مظاہرہ ہوتا ہے، ان باتوں میں چاہے مبالغہ ہو مگر ان کی کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے جو بہت مذموم ہے، مگر ٹکراؤ ہر قوم میں ہوتا ہے اور یہ عموماً قریب تر لوگوں ہی میں ہوتا ہے، ایک خاندان اور پڑوس کے لوگوں میں چاہے وہ کسی مذہب کے ہوں قدم قدم پر ٹکراؤ ہوتا ہے البتہ مسلمانوں کے باہمی جھگڑے اس لیے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں کہ ان میں مخفی ہاتھوں کی بھی کارفرمائی ہوتی ہے۔

لکھنؤ میں شیعہ سنی جھگڑے کی تاریخ قدیم ہے، ۱۹۷۷ء میں بھی دونوں فرقوں میں بڑا فساد ہو گیا تھا جس کے بعد جلوس پر پابندی لگا دی گئی تھی لیکن بی جے پی حکومت نے سیاسی فائدے کے لیے ۱۹۹۸ء میں یہ پابندی ختم کر دی جس کے بعد پھر ٹکراؤ کا اندیشہ ہوا، حال میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی تقسیم سے خطرات اور بڑھ گئے تھے، اسی درمیان میں محرم کا مہینہ شروع ہو گیا اور ۱۰ محرم کو تین بے گناہ مارے گئے، یہی فساد نہیں بلکہ دنیائے اسلام میں ہونے والے شیعہ سنی جھگڑے اور مسلمانوں کی باہمی معرکہ آرائیاں بڑی گہری سازش کا نتیجہ ہوتی ہیں، اسی لیے پریس اور میڈیا کے ذریعہ مسلمانوں کی ٹوٹ پھوٹ کی خبروں کو بڑی دل چسپی سے مشتہر کیا جاتا ہے لیکن ہم کو اس کی شکایت نہیں ہے کہ دوسری قوموں کو مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں سے کیوں اس قدر دل چسپی اور خوشی ہوتی ہے، ہم کو

تو خود مسلمانوں سے شکایت ہے کہ وہ دوسروں کو کیوں اس کا موقع دیتے ہیں، آخر وہ اور ان کے رہنما حالات کی نزاکتوں کو محسوس کیوں نہیں کرتے، وہ دراصل اس وقت پل صراط پر کھڑے ہیں جہاں اگر ذرا بھی قدم ڈگمگایا اور معمولی بے احتیاطی بھی ہوئی تو وہ قعر عمیق میں چلے جائیں گے، انہیں اپنا سود و زیاں خود سمجھنا چاہیے، وہ لڑائی جھگڑے اور اختلاف و افتراق سے کیوں نہیں بچتے اور اس بارے میں اسلامی تعلیم و ہدایت کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں۔

یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ بہار اسمبلی کے نتائج کا اعلان ہونے لگا اور جیسا کہ قیاس آرائی کی جا رہی تھی، معلق اسمبلی کا خطرہ پیدا ہو گیا اور سیکولر پارٹیوں کے عدم اتفاق سے بی جے پی مضبوط اور بہار کو ۱۵ برس تک فرقہ پرستی کے شعلوں سے محفوظ رکھنے والے لالو پرشاد یادو کمزور ہو گئے، جن کے دوست دشمن سب ہی خلاف تھے مگر پھر بھی انہوں نے بہت ڈٹ کر مقابلہ کیا، سب سے زیادہ حیرت ناک رویہ کانگریس کا رہا، وہ مرکز میں برسر اقتدار آنے کے بعد ہی سے یو-پی میں جو کھیل کھیل رہی تھی وہی اس نے بہار کے انتخابات کے وقت وہاں کھیلنا شروع کیا، ایک طرف تو وہ فرقہ پرستوں سے لڑنے کی بات کرتی ہے اور دوسری طرف سیکولر پارٹیوں کی ٹانگ کھینچ کر فرقہ پرستوں کو طاقت بہم پہنچا رہی ہے، ایک طرف فرقہ وارانہ تشدد سے نپٹنے کے لیے جامع قانون بنانے اور اقلیتوں کے حالات پر وہائٹ پیپر تیار کرنے کی بات کر رہی ہے اور دوسری طرف راشٹریہ جنتا دل سے عین انتخاب کے وقت اپنے پرانے اتحاد کو ختم کر کے اس شخص سے ہاتھ ملا لیتی ہے جس کو وزارت کی لالچ میں بی جے پی سے مل جانے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا اور اتر پردیش کو بی جے پی سے دور رکھنے والی پارٹی کی جمہوری حکومت کو گرانے کے لیے ایسی پارٹی سے پینگیں بڑھا رہی ہے جو بی جے پی کے بل پر یہاں اقتدار کا مزہ لوٹ چکی ہے، خیال تھا کہ کانگریس مسلسل ٹھوکریں کھانے کے بعد سنبھل جائے گی مگر وہ سیکولر لوگوں کی آرزوؤں کا خون کر رہی ہے، بہار کے انتخابات سے اس پر اپنی حقیقت عیاں ہو جانی چاہیے۔

جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڈھ طلبہ و طالبات کی دینی تعلیم کا ایک بڑا مرکز ہے، یہ تقریباً نصف صدی سے علمی و تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے، اس کے زیر اہتمام ۲۵ تا ۲۷ فروری کو دعوت اسلامی اور مدارس دینیہ کے زیر عنوان ایک کامیاب سہ روزہ سمینار ہوا، جس میں دعوت

اسلامی کی اہمیت اور طریقہ کار، اس کے فروغ میں مدارس کا حصہ، عصر حاضر میں اس کو درپیش عالمی و ملکی چیلنج اور دعوتی نقطۂ نظر سے موجودہ نظام تعلیم و تربیت میں تغیر وغیرہ پر مفید مقالے پڑھے گئے، ملک کی متعدد و اہم جگہوں دار العلوم دیوبند (وقف)، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، جامعہ دار السلام عمر آباد، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعہ سلفیہ بنارس، دار المصنفین اعظم گڈہ کے علما، جماعت اسلامی ہند کے مرکزی و علاقائی امرا، علی گڑہ مسلم یونی ورسٹی اور حیدر آباد کے دانش وروں کے علاوہ خیریہ کویت کے فضلا نے شرکت کی، اس موقع پر مرکز دعوت کا سنگ بنیاد شیخ نادر عبد العزیز نوری نے رکھا اور شیخ عبد الحمید جاسم البلالی اور المہندس مصطفی محمد الطحان نے مقالے پڑھے، مقالات کے کل چھ اجلاس ہوئے، آخری روز شب میں ایک جلسۂ عام ہوا جس سے اس نواح کے لوگ مستفید ہوئے۔

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ کراچی میں ۲۱ و ۲۲ رفروری کی درمیانی شب میں جناب مشفق خواجہ صاحب کا انتقال ہوگیا، وہ اردو کے ممتاز محقق، نقاد، کالم نویس اور مزاح نگار تھے، خواجہ صاحب کو دل کی بیماری تھی، گزشتہ برس اس کا کامیاب آپریشن ہوا تھا، مگر پھر گردے کی تکلیف شروع ہوگئی جو بڑھتی گئی، انتقال سے ۳-۴ روز قبل طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو وہ اسپتال میں داخل کیے گئے جہاں انتقال ہوگیا، خواجہ صاحب کو علم و ادب سے بڑا شغف تھا، انہوں نے اپنی ادبی، تنقیدی اور تحقیقی نگارشات سے اردو ادب میں اہم جگہ بنالی تھی، وہ بہت اچھے مزاح نگار بھی تھے، خامہ بگوش کے نام سے اس فن میں اپنا جوہر خوب دکھاتے تھے، مرحوم کو دار المصنفین سے بڑا لگاؤ تھا، ابھی دو برس پہلے اس کی اکثر کتابیں منگائیں تھیں، معارف بھی برابر ان کے مطالعہ میں رہتا تھا، ہند و پاک میں زر مبادلہ کی دشواری سے اہل علم کو بڑی پریشانی ہوتی ہے، معارف نہ ملنے سے خواجہ صاحب بھی بہر پریشان رہتے، اس کا علم جناب عبد الوہاب خاں سلیم صاحب کو ہوا تو وہ ان کا چندہ بھیجنے لگے اور تاکید کی کہ پیسے کی وجہ سے ان کا معارف نہ بند کیا جائے، اللہ تعالیٰ خواجہ صاحب کی مغفرت فرمائے۔

☆☆☆

مقالات

شیر ہندوستان ٹیپو سلطان

شعر و ادب کے آئینہ میں

از:- پروفیسر محسن عثمانی ندوی ☆

علامہ اقبال نے ٹیپو سلطان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

آن شہیدان محبت را امام آبروئے ہند و چین و روم و شام

نیلگوں آسمان میں چاند کا حسن ہمیشہ شاعروں کی زبان پر آتا ہے، نو دمیدہ گلاب کے روئے شاداب کا تذکرہ ہر زبان کی شاعری میں موجود ہے، مناظر فطرت میں جس طرح پھولوں کے چمن زار، نسیم بہار، ستاروں کے جھرمٹ، مہر منور اور طلوع و غروب کے منظر احساس کو جگمگا دیتے ہیں، اسی طرح ستودہ صفات شخصیتوں کے کارنامے اور شاہ نامے بھی دل و دماغ کو کیف و نشہ سے سرشار کر دیتے ہیں اور شاعر و ادیب کو ایجاد فن پر آمادہ کرتے ہیں، سلطان ٹیپو کی شخصیت بھی ان عظیم و جلیل شخصیتوں میں ایک تھی جن کا چرخ نادرہ کار بھی ماہ و سال کی سیکڑوں کروٹوں کے بعد تماشائی ہوتا ہے، اس شیدائی اسلام، اس مجاہد آزادی، اس شیر ہندوستان نے میدان کارزار میں لڑتے ہوئے ملک و ملت کے لیے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کردی، وہ بھی نام کے صدام (لفظی معنی بہت زیادہ ٹکرانے والا) کی طرح اپنے آپ کو دشمن کے حوالہ کرکے اپنی جان بچا سکتا تھا اور کچھ لوگوں نے سلطان کو اس کا مشورہ بھی دیا لیکن اس نے مشوروں کے جواب میں جو جملہ کہا اسے تاریخ نے رکارڈ میں محفوظ کرلیا، یہ وہ جملہ ہے کہ شجاعت و مردانگی، عزت نفس اور ثابت قدمی کی اس سے بڑھ کر تعبیر اور بہادری اور غیرت کی اس سے بڑھ کر تصویر نہیں ہوسکتی،

☆ صدر شعبۂ عربی، سیفل، حیدر آباد۔

سلطان نے جواب میں کہا تھا:

"شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے زیادہ بہتر ہے"۔

سلطان ٹیپو کی زبان سے نکلے ہوئے یہ بول جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں، اہل شعر و ادب کے دلوں کو گرما گئے اور روح کو تڑپا گئے، محمود بنگلوری نے سلطان ٹیپو کے لفظوں کو اس طرح شعر کے پیرایہ میں ڈھالا ہے:

ہے آبرو کا پاس تو ہرگز نہ کر قبول
بن کر شغال تجھ کو جو عمر خضر ملے

جان عزیز دے کے بھی کر اس کی آرزو
شیری کا ایک لمحہ شاداں اگر ملے

اب بھی کانوں میں یہاں آتی ہے آواز شہید
قطرہ خون شہیداں میں ہے جان زندگی

گیدڑوں کی زندگی پر موت کو ترجیح دے
شیر بن آزاد ہو، اس میں ہے شان زندگی

شیر آزادی، بیباکی، شجاعت اور طاقت کا استعارہ ہے، اقبال نے اس قوم کو جس میں شیر کی صفات پائی جاتی ہیں، غلام بنانے کا آسان طریقہ یہ بتایا کہ قوم کو مکر وفن کے ذریعہ ان صفات سے محروم کردیا جائے تا کہ قوم غلام بن جائے اور غلامی اور دوسروں کی تقلید پر فخر کرنے لگے۔

اچھا ہے کہ شیروں کو سکھا دو رم آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

مولانا ظفر علی خاں نے سرنگا پٹم کی زیارت کے بعد جو دل گداز نظم لکھی ہے اس میں بھی سلطان کے قول کی بازگشت نظر آتی ہے، چند اشعار یہ ہیں:

آخری قول یہ اس کا نہ ہمیں بھولے گا
جس سے قایم ہوئیں آئین حمیت کی حدود

شیر اچھا ہے جسے مہلت یک روزہ ملی
یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود

کشور ہند کا رنگ اور ہی ہوتا کچھ آج
مکر کا دام بچھاتا نہ اگر چرخ کبود

سو رہا ہے ترے پہلو میں وہ میسور کا شیر
مایہ ناز تھا ملت کے لیے جس کا وجود

قوت بازوئے اسلام تھی اس کی صولت
اس کی دولت کے دعاگوؤں میں شامل تھے ہنود

کہیں سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے
اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ براندام حسود

اس کے اٹھتے ہی مسلماں کا گھر بیٹھ گیا
تھا قیامت کا قیام اور قیامت کا قعود

جب مغلیہ سلطنت کا سورج لب بام آچکا تھا اور انگریزوں کے قدم ایسٹ انڈیا کمپنی کی

شکل میں جم چکے تھے، ہندوستان کی خاک سے وہ لعل شب چراغ پیدا ہوا جس کا نام فتح علی خان سلطان ٹیپو (سال شہادت ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء) ہے، یہ دکن کا وہ فرماں روا ہے جس کی بلند نظری اور محبت اسلام کی نظیر اسلام کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی، یہ وہ مجاہد آزادی ہے جس کے ساتھ اپنوں نے دغا نہ کی ہوتی تو انگریزوں کو اس ملک سے اپنی بساط لپیٹ دینی پڑتی، اسلامی ہند نے اس سے بڑھ کر محب اسلام اور محب وطن اور غیرت مند، آئین جہاں بانی اور جہاں بینی سے واقف کسی سلطان کو پیدا نہیں کیا، انگریز یہ سمجھتے تھے کہ جب تک سلطان زندہ ہے ان کا چراغ اس ملک میں دیر تک جل نہیں سکتا، چنانچہ سلطان کی شہادت کے بعد اس کی لاش پر کھڑے ہوکر انگریز جنرل ہارس نے کہا کہ "آج سے ہندوستان ہمارا ہے" گویا سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں کے ملک پر کامل اقتدار میں رکاوٹ باقی نہ رہی، یہ شعر سلطان پر پورے طریقہ پر صادق آتا ہے:

درمیان کارزار کفر و دین
ترکش مارا خدنگ آخریں

ٹیپو سلطان کی بالغ نظری، دور بینی اور تدبر کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے انگریزوں کے خلاف عالمی محاذ بنانے اور بین الاقوامی تجارت اور بحری طاقت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی، یہ وہ کار جہاں بینی اور جہاں بانی ہے جس کی کوئی مثال ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں نہیں ملے گی، اس نے بار بار خلافت عثمانیہ ترکی میں وفود بھیجے، نپولین تک سے سلسلہ جنبانی کی، ایران اور افغانستان سے راہ رسم پیدا کی، دنیا کی تجارتی بندرگاہوں کو کرایہ پر لینے کی کوشش کی، بحری بیڑے کو مضبوط کیا، جہاز سازی کی صنعت قایم کی، اسلحہ سازی کے کارخانے بنائے، ہندوستان میں والیان ریاست کو انگریزوں کے خلاف محاذ بنانے کی بار بار تلقین کی، نظام حیدرآباد کو اخوت اسلامی کا حوالہ اور خدا رسول کا واسطہ دیا لیکن تقدیر وہ چٹان ہے جس سے تدبیریں ٹکرا کر پاش پاش ہوجاتی ہیں اور وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے، سلطان ٹیپو نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی لیکن ہمیشہ کے لیے دنیا میں حریت اور آزادی کے چاہنے والوں کے لیے اور عصر حاضر کے ان تمام مسلم فرماں رواؤں کے لیے جنھوں نے بڑی طاقتوں کے سامنے سر بزیری اور سپر افگندگی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے، غیرت و حمیت کا، عزت نفس کا اور اسلام کے لیے جینے اور مرنے کا پیغام دیا ہے، مسلم حکم رانوں کے نام سلطان کا پیغام یہ ہے کہ زندگی لہو ترنگ ہے، جل ترنگ نہیں، یہ

کوشش اور کشاکش اور جہاد سے عبارت ہے اور ہمیشہ لہو کو گرم رکھنے کا نام ہے، آج عالم اسلام جس نامرادی اور زبوں طالعی کا شکار ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ اس نے جفاکشی اور مقابلہ اور علم کی دنیا سے فرار کی راہ اختیار کرلی ہے اور صنعت اور حرفت میں خود کو دوسروں کا دست نگر بنالیا ہے، اقبال نے ضرب کلیم میں سلطان ٹیپو کی وصیت کے عنوان سے جو نظم کہی ہے اس کا روئے سخن عرب کے عیش پسند، عشرت کے دل دادہ اور آرام طلب امریکی فتراک کے نخچیر حکم رانوں کی طرف کردیجیے تو محسوس ہوگا کہ آج بھی اس نظم کی تازگی اور پیغام کی معنویت پورے طور پر باقی ہے، وہ سلطان کی زبانی کہتے ہیں:

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول — لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز — ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدہ کائنات میں — محفل گداز گرمی محفل نہ کر قبول
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے — جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے — شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

غالباً اس کو عالم عرب کے حکم رانوں میں کوئی ایک بھی حکم راں ایسا نہ مل سکا جو اس کا ہم راز، دم ساز اور ہم آواز ہو جو اس کا ہم فکر، ہم خیال، شریک سفر اور شریک حال ہو اور جس کو وہ یہ کہہ سکے:

بیا تا کار ایں امت بسازیم — قمار زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر — کہ دل در سینہ ملا گدازیم

اقبال کے اشعار میں رہ نورد شوق، محفل گداز، دریائے تند و تیز کے جو استعارے استعمال ہوئے ہیں، ان کو سمجھنے کے لیے حیدر علی اور اس کے فرزند ٹیپو سلطان کی زندگی کا مطالعہ ضروری ہے، ان دونوں کے زندگیوں میں چار پانچ بڑی جنگیں انگریزوں سے ہوئیں، ۱۷۶۱ء میں حیدر علی نے میسور کا اقتدار سنبھالا تھا، اس وقت مجموعی طور پر ملک میں انگریزوں کی عمل داری قایم ہوچکی تھی، بنگال میں پلاسی کی جنگ میں انگریزوں کے مقابلہ میں میر جعفر کی غداری سے نواب سراج الدولہ کو شکست ہوچکی تھی، بکسر کی لڑائی میں ۱۷۶۴ء میں اودھ پر بھی انگریزوں کا

اقتدار قایم ہوچکا تھا، ارکاٹ (کرناٹک) کے تخت پر انگریزوں نے اپنے حلیف محمد علی کو بٹھایا تھا، حیدر آباد کا نظام بھی انگریزوں سے دوستی اور موالات کرچکا تھا اور ان کی بالادستی تسلیم کرچکا تھا، انگریزوں کے پھیلائے ہوئے جال میں یہ دونوں والیان ریاست صید زبوں بنے ہوئے تھے، مدراس پر انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ تھا، انگریز مرہٹہ اور حیدر آباد کا نظام اور کرناٹک کا محمد علی سب مل کر میسور کے غیور و جسور فرماں روا کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے، متحدہ فوج کی قیادت انگریز کمانڈر جنرل اسمتھ کو دی گئی تھی، انگریزوں نے بمبئی سے اپنی فوج لڑائی کے لیے مغربی ساحلی شہر منگلور میں اتار دی تھی، حیدر علی نے اپنے بہادر اور قابل و فاضل فرزند سلطان ٹیپو کو انگریزوں سے جنگ پر مامور کیا، اس وقت سلطان کی عمر صرف ۱۷ سال تھی، اسی سترہ سال کی عمر میں جو جوانی کی راتیں اور مرادوں کے دن سے عام طور پر عبارت ہے، سلطان محمد فاتح نے ترکی پر حملہ کیا تھا اور خشکی پر بھاری توپوں سے لدے ہوئے جہازوں کو لکڑی کے تختوں پر کھینچ کر قسطنطنیہ کی فصیل تک پہنچا دیا تھا اور پھر قسطنطنیہ فتح ہوگیا تھا، یہی عمر سلطان ٹیپو کی بھی تھی، سلطان ٹیپو نے عقاب کے مانند تیزی کے ساتھ پہنچ کر منگلور کا محاصرہ کرلیا، پیچھے سے حیدر علی کمک لے کر پہنچا، اگرچہ حیدر علی کے مقابلہ میں انگریزوں کی ٹڈی دل فوج بہت زیادہ تھی لیکن حیدر علی کی بہادر فوج سے کچھ اس درجہ انگریز خایف ہوئے کہ سمندری راستہ سے فوج لے کر فرار ہوگئے اور اسلحہ اور گولہ بارود کا بڑا ذخیرہ چھوڑ گئے، متحدہ افواج کی شکست سے مرہٹہ فوجیں اور نظام حیدر آباد کے سپاہی گھبرا اٹھے، کرناٹک کے نواب کی فوجیں مدراس بھاگنے پر مجبور ہوگئیں، اس جنگ میں سیکڑوں انگریز سپاہی گرفتار ہوئے، انگریزی فوج کی کمان جنرل اوڈ کی طرف منتقل ہوچکی تھی، اس نے حیدر علی سے صلح کرلی، حیدر علی کا پلڑا اس جنگ میں اتنا بھاری تھا کہ اگر وہ صلح نہ کرتا اور انگریزوں کا تعاقب کرتا ہوا فشدوا الوثاق پر عمل کرتا تو ہندوستان کی تاریخ دوسری ہوتی، اگرچہ صلح نامہ بھی حیدر علی کی طرف داری کرتا تھا اور اس کے مفادات کا تحفظ کرتا تھا لیکن انگریزوں کو اب پھر سے تیاری کا موقع ملا اور پھر انہوں نے صلح کی شرطوں کی مخالفت شروع کردی اور جب مرہٹوں نے میسور پر دوبارہ یورش کی تو انگریزوں نے صلح کی شرط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حیدر علی کا ساتھ نہیں دیا، اس جنگ میں مرہٹوں کے مقابلہ میں بھی سلطان ٹیپو نے سپہ گری اور جواں مردی

کے وہ جوہر دکھائے کہ اس کے باپ حیدر علی حیرت زدہ ہو گئے، دریائے کاویری کا ساحل ہزاروں مرہٹہ سپاہیوں کی لاش سے بھر گیا، سلطان مظفر منصور واپس آیا۔

انگریز حیدر علی کے ساتھ دب کر مصالحت کو اپنی شکست تسلیم کرتے تھے اور اس شکست کا انتقام لینے کے درپے تھے اور دوسری جنگ کی تیاری کر رہے تھے تاہم تنہا ان کو حیدر علی سے مقابلہ کی ہمت نہ تھی، اس لیے وہ مرہٹوں کو جنگ پر اکسا رہے تھے، مرہٹوں کو تیار کر لینے کے بعد کرناٹک کے محمد علی کو تیار کر لینا مشکل نہ تھا کہ وہ پہلے ہی سے انگریزوں کا نمک خوار تھا، نظام حیدر آباد گنتور پر انگریزوں کے قبضہ کی وجہ سے ناراض تھا، حالات کے دباؤ کے تحت انگریزوں نے نظام حیدر آباد کی استمالت کے لیے گنتور کا علاقہ واپس کر دیا اور اس طرح نظام بھی انگریزوں کی متحدہ افواج کا رکن رکین بن گیا، اب جنگ کا آغاز ہوا تو حیدر علی نے اہم مورچوں کے لیے اپنے لایق و فایق فرزند ٹیپو سلطان کا انتخاب کیا، اس وقت اس کی عمر ۲۹ - سال تھی، پولی لور کے مقام پر انگریزی افواج خیمہ زن تھی یہاں گھمسان کا رن پڑا، ٹیپو کے مقابلہ میں کرنل بیلی کی زیر قیادت انگریزی فوج کو شکست فاش ہوئی اور اس کے سیکڑوں سپاہی مارے گئے اور دو ہزار کی تعداد میں گرفتار ہوئے، گرفتار شدہ انگریزی فوج سرنگا پٹم بھیج دی گئی، حیدر علی کی فوج کا ویلور پر قبضہ ہو گیا اور محمد علی کی شکست کے بعد ارکاٹ اس کی تحویل میں آ گیا، انگریزوں نے حیدر علی سے پھر صلح کی درخواست کی، سابقہ بدعہدی کی وجہ سے حیدر علی نے یہ درخواست منظور نہیں کی، ٹیپو کی زیر قیادت فوج مورچوں کو فتح کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی، یہاں تک کہ مدراس پہنچ کر ۱۰/ اگست ۱۷۸۱ء کو میسوری فوج نے انگریزی فوج کے قلب پر ایسا حملہ کیا کہ انگریزوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور انگریزی فوج نے بھاگ کر بحری جہازوں میں پناہ لی، ہزاروں انگریز فوجی مارے گئے اور دو ہزار گرفتار ہوئے، اس جنگ میں فرانسیسی بھی حیدر کے نہ صرف طرف دار تھے بلکہ جنگ میں کارگذار تھے، گوا میں فرانسیسی قابض تھے، انگریزوں اور فرانسیسیوں میں رقابت نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم گیر پیمانہ پر چل رہی تھی، یہ حیدر علی کی ذہانت تھی کہ اس نے اس سے فایدہ اٹھایا اور فرانسیسیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا، انگریزوں کے ساتھ جنگ ابھی پورے طور پر فیصلہ کن انجام تک نہیں پہنچی تھی کہ حیدر علی سرنگا پٹم میں بیمار ہوا اور اس کا وقت موعود آ گیا، حیدر علی اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس نے ٹیپو کو جنگ کے مورچوں سے واپس بلا لیا

اور اس سے پہلے کہ پورے ملک سے انگریزوں کا نام و نشان مٹ جاتا ٹیپو کو محاذ جنگ سے واپس ہونا پڑا اور ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ حیدر علی کا جو حب وطن، بہادری اور انتظامی صلاحیت میں فرد تھا اور جس کے سینہ میں اسلام کا درد تھا، انتقال ہو گیا۔

انگریزوں کے خلاف دو تین اور جنگیں سلطان ٹیپو کی تاج پوشی اور جاں نشینی کے بعد شروع ہوئیں، سلطان ٹیپو کی تربیت انگریزوں کے خلاف جنگ و جہاد کے ماحول میں اور تیغ کے سایہ میں ہوئی تھی اور وہ اقبال کے الفاظ میں تیغوں کے سایہ میں پل کر جواں ہوا تھا، اس کے باحمیت باپ نے اسے بتایا تھا کہ شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام ہے اور سخت کوشی سے تلخ زندگانی شیریں اور انگبیں بن جاتی ہے، چنانچہ وہ دوسرے حکم رانوں کی طرح کبھی پالکی پر شاہانہ بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا، گھوڑے کی سواری پسند کرتا، اس کے گھر میں شیر پلے ہوئے تھے، اس کی زندگی از اول تا آخر شمشیر و سناں سے عبارت تھی، طاؤس و رباب اور شراب و شباب سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا، نماز اور معمولات کا پابند، خود عالم و فاضل اور علم و فضل کا قدرداں تھا، حیدر علی مدبر تھا، فریس تھا اور جنگ آزما تھا لیکن علم و فضل سے محروم تھا لیکن اس نے اپنے بیٹے کو وقت کے قابل اساتذہ کی نگرانی میں علم و فن کے زیور سے آراستہ کیا تھا اور سلطان ٹیپو علم و ادب سے آراستگی کے اعتبار سے ''اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند'' کا مصداق تھا۔

سلطان ٹیپو نے حیدر علی کے چھوڑے ہوئے مشن کو ''چھیڑ خوبان سے چلی جائے اسد'' کے مصداق جاری رکھا لیکن یہ چھیڑ خانی خوبان سے نہ تھی بلکہ ان سے تھی جو حرص و آز کے دندان کو تیز کیے ہوئے تھے اور پورے ہندوستان کو اپنا لقمہ تر بنانا چاہتے تھے، ۱۷۸۳ء کو میسوری فوجوں کا انگریزوں سے سخت خوں ریز مقابلہ ہوا، میسوری فوجوں کا کریم گڑھ کے انگریزوں کے قلعہ پر قبضہ ہو گیا، سلطانی فوج ظفر موج فاتح اور سرخ رو ہوئی اور انگریزوں کا زبردست جانی اور مالی نقصان ہوا، انگریزوں کا یہ طریقہ کار رہا ہے کہ جب ان کو شکست ہونے لگتی تو فوراً صلح کی پیش کش کر بیٹھتے تا کہ ان کو تیاری کی کچھ اور مہلت مل جائے، مورخین لکھتے ہیں کہ انگریزوں کے توسیع پسندانہ عزایم کو خاک میں ملانے کا سنہری موقع سلطان ٹیپو کو اس بار عطا ہوا تھا، لیکن ٹیپو مسلسل انگریزوں سے جنگ کے نتیجہ میں اپنے عوام کے لیے اور رفاہ عام کے کام کے لیے کچھ کرنے کا موقع نہیں

پاتا تھا، اس لیے اس نے صلح کی درخواست منظور کرلی، انگریزوں نے پھر وعدہ کیا تھا کہ وہ صلح کے شرایط پر کاربند رہیں گے، نیکی اور رحم دلی کی وجہ سے سلطان کا حال اس شعر کے مصداق تھا:

پھر سہو ہوگئیں تری وعدہ خلافیاں پھر انتظار ہے مجھے عہد جدید کا

اس جنگ اور صلح کے بعد سلطان ملکی اصلاحات میں اور تصنیفات تیار کرانے میں اور کچھ داخلی بغاوتوں پر قابو پانے میں مصروف رہا، سلطان مذہب کے معاملہ میں زبردستی کا قایل نہ تھا اور ہندو عوام بھی اس کے عقیدت مند تھے لیکن اس نے سلطنت کے قیدیوں کے سامنے اسلام کی تعلیمات کو موثر طریقہ سے پیش کیا اور بہت سے قیدیوں نے اسلام قبول کیا لیکن سلطان کبھی شمشیر کو نیام میں نہ رکھ سکا اور کبھی اطمینان کی سانس نہ لے سکا، کبھی چین کی نیند نہ سو سکا، ہر وقت میدان کارزار تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھتا ہوا غبار تھا، جب انگریزوں کے ساتھ منگلور کا صلح نامہ تیار ہوگیا تو مرہٹہ خوف زدہ ہوئے کہ اب ان کی باری ہے، انگریزوں نے تو صلح کرلی ہے، اس لیے سلطان مرہٹوں کو بے یارومددگار سمجھ کر ان کو ان کی شرارتوں کا مزا چکھائے گا، چنانچہ مرہٹوں نے نظام حیدرآباد کو ورغلایا جو میسور کی اس ابھرتی ہوئی طاقت کا دشمن تھا، چنانچہ مرہٹوں کی اسی ہزار اور نظام کی نوے ہزار فوج ساتھ مل کر حملہ کے لیے میسور کی طرف بڑھی، سلطان نے اس جنگ کو ٹالنے کی بہت کوشش کی اور نظام کو خط لکھا کہ وہ اپنی زندگی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے وقف کرچکا ہے، بہ حیثیت مسلمان آپ کو میرا ساتھ دینا چاہیے نہ کہ مجھ سے جنگ کرنا چاہیے، فریقین کے درمیان پایدار تعلقات کے لیے اس نے باہمی شادی کے رشتوں کی بھی پیش کش کی لیکن نظام نے ناعاقبت مشیروں کے کہنے سے تجویز کو مسترد کردیا اور سلطان ٹیپو کے سفیر بے نیل مرام حیدرآباد سے واپس آئے، نظام نے ارادہ کیا تھا جنگ کا لیکن پھر فوج کی کمان مہابت جنگ کے حوالہ کرکے الٹے پاؤں واپس ہوا، گویا نیولے نے اپنے ہاتھ میں تلوار لی اور پھر شیر کے خوف سے دوسروں کے حوالہ کردی، مرہٹوں اور نظام کی فوج نے ابتدائی پیش قدمی میں بادامی اور دھارواڑ کے علاقوں کو فتح کیا لیکن جب سلطان ٹیپو کو اس پیش قدمی کی اطلاع ملی تو اس نے ایسا حملہ کیا کہ نظام کا کمانڈر مہابت جنگ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا، مہابت جنگ کی بیوی نظام کی لڑکی تھی، وہ چاہتا تو اپنی شرطوں پر نظام کو جھکا سکتا تھا لیکن اس نے مہابت جنگ کے اہل خانہ کو

رائے چور جانے دیا، جنگ میں سلطان ٹیپو کو فتح ہوئی اور متحدہ فوج کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔

انگریزوں اور اس کے اتحادیوں سے تیسری لرزہ خیز جنگ عظیم مئی ۱۷۹۰ء سے شروع ہوکر دسمبر ۱۷۹۰ء تک جاری رہی، انگریز پچھلی جنگوں میں شکست کا انتقام لینا چاہتے تھے اور انہوں نے خوب تیاری کی اور مرہٹوں اور نظام کو بھی اس کے لیے تیار کرلیا، سلطان نے ہر چند کوشش کی کہ نظام انگریزوں کا ساتھ نہ دے، اس نے نظام کو پھر خط لکھا اور یہ پیش کش بھی کی کہ وہ اپنے لڑکے کی شادی نظام کی لڑکی سے کرنے کے لیے تیار ہے تاکہ باہمی رشتہ داری سے اخوت اور مودت استوار ہوجائے لیکن نظام کے وزیر میر عالم کی جنرل کارنوالس کے ساتھ سازباز کی وجہ سے یہ سلسلہ جنبانی کامیاب نہ ہوا، سلطان نے مرہٹوں سے بھی مصالحت کی کوشش کی لیکن بے سود، آخرکار اتحاد ثلاثہ سے ٹیپو کو جنگ کرنی پڑی، انگریزوں نے ان راجاؤں سے بھی مدد لی جن کو ان کی غداری کی وجہ سے سلطان نے بے دخل کردیا تھا، انگریزوں نے فتح کے بعد ان کے علاقوں کو بحال کرنے کا وعدہ کیا، انہوں نے میسور کے مسلم افسروں کو ورغلایا اور لالچ دی اور ان کو سلطان کے خلاف جاسوسی پر آمادہ کرلیا، چنانچہ میر امام الدین اور میر اسماعیل وغیرہ ان کے بہکانے میں آگئے، جب ان کی جاسوسی کا حال سلطان کو معلوم ہوا تو سلطان نے ان کو گرفتار کرکے قتل کرادیا، انگریزوں کی فوج کلکتہ اور بمبئی سے بڑھی، حیدرآباد سے نظام کی ساٹھ ہزار کی فوج بڑھی، مرہٹہ سردار بھی ساٹھ ہزار کی فوج لے کر آگے بڑھے، یہ گویا جنگ احزاب تھی، دو لاکھ سے زیادہ کی متحدہ فوج سلطنت خداداد میسور کا خاتمہ کرنے کے لیے آگے پیش قدمی کررہی تھی، سلطان کی فوج چند ہزار سے زیادہ نہ تھی، جنرل کارنوالس کی فوجیں بنگلور پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئیں، سلطان نے رسد کے تمام راستوں پر قبضہ کرکے کمک اور غذائی مدد کی لائین کو کاٹ دیا، بنگلور پر بھی انگریزوں کا قبضہ اس طرح ہوا کہ بنگلور کے اس قلعہ پر جس کی حفاظت کی ذمہ داری پر سلطان نے کرشنا راؤ کو مامور کیا تھا، اس کرشنا راؤ کو انگریزوں نے اقتدار کا لالچ دے کر خرید لیا اور وہ انگریزوں کو قلعہ کے اندر کی تمام خبریں پہنچانے لگا اور جب انگریزوں نے گولہ باری کرکے فصیل کے ایک حصہ میں شگاف ڈال دیا تو اس جانب کرشنا راؤ نے محافظ دستہ میں کمی کرکے بہ وقت شب حملہ کرنے کا خفیہ پیغام دیا، چنانچہ انگریزوں نے رات کے وقت حملہ کردیا اور سلطان کی فوجوں کی

مزاحمت کے باوجود بنگلور کے قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور ایک ہزار کے قریب سلطان کے مجاہدین شہید ہوئے، سلطان نے اطلاع ملتے ہی کمک بھیجی لیکن اس وقت تک قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تھا، سلطان کو جب کرشنا راؤ کی غداری کی اطلاع ملی تو اس نے اس کو گرفتار کرلیا اور اس کو پھانسی کی سزا دے دی، سلطان نے میر قمر الدین کی قیادت میں جس نے ابھی تک بے وفائی نہیں کی تھی اور جو اس وقت قابل اعتماد افسر تھا، بنگلور کی طرف فوج روانہ کی، اس کی پہلی مڈبھیڑ قلعہ کے سامنے اس دستہ سے ہوئی جس میں حیدرآبادی فوجی بھی شامل تھے، میر قمر الدین نے دو سو انگریزی اور حیدرآبادی فوجوں کو قبضہ میں لے لیا اور دشمن کو پسپا ہونا پڑا، نظام حیدرآباد کی دیگر فوجیں بھی بنگلور کے قلعہ پر انگریزوں کی کامیابی سے مطمئن اور مسرور ہوکر دریائے کرشنا کو عبور کرکے رائے چور ہوتے ہوئے میسور میں داخل ہوگئیں، دوسری طرف سے مرہٹہ فوجیں بھی داخل ہوگئیں، دھارواڑ کے قلعہ پر دشمن کی فوجوں کا قبضہ ہوگیا اور اب دارالسلطنت کی ناکہ بندی بھی شروع ہوگئی اور اسی پر کامل فتح و شکست کا انحصار تھا، سلطان نے نہ صرف زبردست مقابلہ کیا بلکہ دارالسلطنت کی جانب آنے والے راستوں کی ناکہ بندی میں بھی کامیاب ہوگیا، چنانچہ رسد کے تمام راستے بالکل مسدود ہوگئے اور دشمن کی فوجیں کچھ عرصہ کے بعد راشن کے لیے ترس گئیں، چنانچہ مجبوری کی حالت میں دشمنوں کو محاصرہ ختم کرنا پڑا اور صلح کی جانب پیش رفت شروع ہوگئی، کارنوالس نے اپنے تمام ہتھیاروں کو دفن کردیا یا دریا میں پھینک دیا تاکہ وہ سلطان کی فوج کے ہاتھ نہ آئیں، انگریزوں کی فوج ذلت اور رسوائی کے ساتھ واپس ہوئی، برسات گذر جانے کے بعد مرہٹوں انگریزوں اور نظام کی فوجوں نے دوبارہ سری رنگاپٹم کا محاصرہ کرنے کی کوشش کی لیکن سلطان نے دریائے کاویری سے آگے دشمن کی فوج کو بڑھنے نہیں دیا، چھوٹی موٹی لڑائیوں سے جنگ کا فیصلہ نہیں ہوا، آخرکار سلطان نے اپنی پوری فوجی طاقت کو مجتمع کرکے حملہ کیا، انگریزوں کے بعض مفتوحہ علاقوں پر سلطان کی فوجوں کا قبضہ ہوگیا اور انگریز سپاہی دریا عبور کرکے فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے، اگر اسی وقت سلطان کی فوجوں نے دشمن کی فوجوں کا تعاقب کیا ہوتا تو دشمن تازہ دم ہوکر دوبارہ محاصرہ کی ہمت نہ کرتا، پایان کار یہ جنگ پھر صلح کے معاہدہ پر ختم ہوئی اور یہ صلح انگریزوں کی شرائط پر کی گئی، سلطان کے کئی فوجی اور انتظامی افسروں کو انگریزوں نے خرید لیا تھا،

تاہم اس جنگ میں دو لاکھ کی متحدہ افواج کا چالیس ہزار کی فوج سے مقابلہ کرلینا اور شکست سے دوچار نہ ہونا بھی سلطان کی قابلیت کی دلیل ہے، اس جنگ کے بعد سلطان نے قسطنطنیہ، ایران، افغانستان کے شاہان عالی مقام کے دربار میں سفارتیں بھیجیں اور انگریزوں کے شر اور سازش سے انہیں آگاہ کرنے کی کوشش کی لیکن سلطان کو کامیابی نہ ہوسکی، انگریزوں نے اپنی فتنہ انگیزی سے ایران اور افغانستان کو اس جھوٹے بہانہ سے لڑوا دیا کہ افغانستان میں شیعوں پر مظالم ہورہے ہیں اور جب ایران اور افغانستان باہم نبرد آزما ہوجائیں تو ان دونوں کی فوجیں سلطان کی مدد کیسے کرسکتی ہیں۔

سلطان کی تمام تدبیریں ناکام ہوئیں اور تدبیر کے انجام ہی کا نام تقدیر ہے، ہندوستان کی تقدیر میں انگریزوں کی غلامی لکھ دی گئی تھی، یہ بھی مقدر کی بات تھی کہ بہت سے میر جو سلطان کے یا نظام کے مشیر تھے، سلطان کے پیروں کے لیے زنجیر ثابت ہوئے اور انہوں نے غداری کی اور انہوں نے سلطان کی تدبیروں کو ناکام بنادیا، سراج الدولہ کے لیے تو ایک میر جعفر تھا، سلطان ٹیپو کے لیے کئی میر تھے، وزیر اعظم میر صادق، میر معین الدین، میر قمر الدین میر عالم حیدرآباد، یہ سارے میر انگریزوں کے طرف دار اور سلطنت خداداد کے دشمن ثابت ہوئے، ان کا ساتھ دینے والے غلام علی لنگڑا اور بورنیا بھی تھے، ان میں سے اکثر وہ تھے جنہوں نے کسی خیانت یا سازش کا ارتکاب کیا تھا اور معزول کردیے گئے تھے، جب کوئی لکھنے والا تاریخ اسلام میں ملت فروشوں کی داستان لکھے گا تو ان میروں میں سے ہر میر تاریخ میں خیانت، بدعہدی اور غداری کا ایک عنوان بن جائے گا، اقبال نے ان ملت فروشوں میں سے دو کے بارے میں کہا ہے:

جعفر از بنگالہ صادق از دکن　　ننگ ملت ننگ دیں ننگ وطن

کارزار کفر و دین کا آخری، چوتھا اور فیصلہ کن معرکہ ۱۷۹۹ء کو شروع ہوا، جنرل ہارس کی کمان میں ۲۱- ہزار مسلح فوج ویلور کے مقام پر جمع ہوئیں اور میسور کی طرف بڑھیں، نظام حیدرآباد کے ۱۶- ہزار سپاہی میر عالم کی قیادت میں اس فوج کے ساتھ شامل ہوگئے، بمبئی سے سات ہزار تجربہ کار انگریز سپاہی اس فوج سے آکر مل گئے، متحدہ فوجوں کے مقابلے کے لیے مغربی محاذ پر سلطان کی فوج کامیاب رہی، یہاں سلطان میر قمر الدین کو محاذ پر انچارج بنا کر شرقی محاذ کی طرف بڑھا،

میر قمر الدین کی غداری کی وجہ سے جنرل اسٹورٹ کی فوج جس کو سلطان شکست دے چکا تھا، دار السلطنت تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی، جگہ جگہ غداروں کی خفیہ سازش کی وجہ سے انگریزوں کو کامیابی ملتی گئی۔

۱۷۹۹ء میں مئی کی چار تاریخ کو سلطان کا قلعہ ہر طرف سے محاصرہ میں آچکا تھا، علی الصباح حسب معمول سلطان نے نماز فجر جماعت سے ادا کی، نماز کے بعد سلطان کے پرائیویٹ سکریٹری حبیب اللہ نے سلطان کو یہی مشورہ دیا کہ وہ جان عزیز پر رحم کھائیں اور شہزادوں کی یتیمی اور اسیری کا تصور کریں، سلطان نے بہادرانہ جواب دیا کہ انسان کو موت صرف ایک بار آتی ہے اور اس سے ڈرنا لاحاصل ہے، میں اپنی ذات کو اور اپنی اولاد کو دین محمدی پر نثار کرنے کا فیصلہ کرچکا ہوں، انگریزوں نے ہر طرف سے حملہ کردیا، میر معین الدین نے ایک خاص طرف سے جہاں شگاف پڑ چکا تھا انگریزوں کو حملہ کرنے کا اشارہ دیا، فوج فصیل شہر کے اندر داخل ہوگئی، سلطان کے وفا شعار سپاہی لڑتے ہوئے شہادت کا جام نوش کررہے تھے، سلطان دہلی دروازہ سے باہر نکلا اور انگریزی افواج کا مسلسل مقابلہ کرتا رہا اور جب سلطان نے دروازہ سے دوبارہ اندر آنے کی کوشش کی تو سلطان کو واپس آتا دیکھ کر بدبخت میر صادق نے اندر سے دروازہ بند کرلیا، صبح سے مسلسل لڑتے لڑتے سلطان کے جسم پر کئی زخم لگ چکے تھے، شام ہونے کو آئی تھی، سورج شفق کی سرخ گلگونہ چادر بچھا چکا تھا، زمین سیکڑوں مجاہدین کے خون سے لالہ زار بن چکی تھی، سلطان کے ایک نومسلم خادم کو سلطان کا حال زار دیکھ کر رحم آیا اور اس نے اس کو انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کا مشورہ دیا تاکہ کم از کم جان بچ جائے، سلطان نے جلال سے بھرے ہوئے لہجہ میں تاریخی جملہ کہا ''میرے نزدیک شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے''، کچھ دیر میں سلطان کے گھوڑے کو گولی لگی، گھوڑا زمین پر گر گیا، سلطان پیاس سے بھی بے تاب تھا، یہاں ایک دوسرا میدان کربلا تھا اور حیدر علی کا فرزند اور خاندان حسینی کا مجاہد پانی کے قطرہ کے لیے ترس رہا تھا، اس اثنا میں سلطان کے سر میں گولی لگی اور یہ محب اسلام، محب حریت، محب وطن مجاہد جو سپاہی بھی تھا، سپہ سالار بھی تھا اور تنہا لشکر جرار بھی تھا، موت کی آغوش میں چلا گیا اور اس کا شمار ان لوگوں میں ہونے لگا جن کے بارے میں شاعر نے کہا تھا:

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

سلطان کی لاش کو باہر لایا گیا، ایک عینی شاہد کی روایت ہے کہ آنکھ کھلی ہوئی تھی اور جسم گرم تھا، کرنل ویلزلی کو شبہ ہوا کہ سلطان زندہ ہے، اسی کی طرف ظفر علی خان نے اپنے شعر میں اشارہ کیا:

کہیں سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے
اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ براندام حسود

جنرل ہارلس سلطان کی لاش کو دیکھ کر فرط مسرت سے چیخ اٹھا اور یہ کہہ اٹھا ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے''۔

وطن کی حفاظت اور دین اسلام کی عظمت کے خاطر سلطان نے موت کو گلے سے لگا لیا اور شہادت کی خلعت فاخرہ پہن لی، یہ زمین صرف سلطان ٹیپو اور اس کے جاں باز ساتھیوں کی رزم گاہ نہ تھی، یہ ہندوستان میں سطوت اسلام کی شہادت گاہ تھی، سلطان کا جسم لہولہان تھا، بدن پر زخموں کے پھول کھل اٹھے تھے، ملبوس خون کی گلکاریوں سے زرکار بن چکا تھا، دل شوق شہادت سے بے تاب، زبان پیاس کی شدت سے ماہی بے آب، جسم میں تھوڑی سی زندگی کی رمق اور افق پر پھولتی ہوئی اور پھیلتی ہوئی شفق، زمین خون شہیداں سے لالہ زار، گوشہ آسمان شہداء کی روح کے استقبال کے لیے گلستاں بکنار، میدان جنگ میں بڑھتا ہوا اندھیرا اور مادر ہند میں انگریزی اقتدار کا پھیلتا ہوا سویرا، پھر حریت کا سورج غروب ہوگیا لیکن ہر غروب کے لیے طلوع مقدر ہے، حریت کا آفتاب اگست ۱۹۴۷ء میں پھر طلوع ہوا اور سلطان ٹیپو کے قاتلوں کے لیے ہندوستان میں اقتدار کا سورج غروب ہوگیا اور جن کی حکومت میں سورج کبھی ڈوبتا نہ تھا، ان کی طاقت اور سطوت دنیا میں باقی نہ رہی، ''ہر عروجے را زوال'' کا مقولہ سچ ہوکر رہا، سلطان کی زندگی کا مطالعہ کرنے والا اور اس کی سوانح کی کتاب کو بسم اللہ کی ب سے تمت کی ت تک پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ اس دور آخر میں ایسی چنگاری بھی خاکستر میں موجود تھی، چنانچہ علامہ اقبال کی فارسی اور اردو میں سلطان کے بارے میں نظمیں ہیں جو سلطان سے اس کے گہرے تاثر کی آئینہ دار ہیں، علامہ اقبال سلطان ٹیپو کے بارے میں کہتے ہیں:

آتش در دل دگر بر کردہ ام
داستانے از دکن آوردہ ام

در کنارم خنجر آئینہ فام   می کشم او را بتدریج از نیام
نکتہ گویم ز سلطان شہید   زانکہ ترسم تلخ گردد روز عید
پیشتر رفتم کہ بوسم خاک او   تا شنیدم از مزار پاک او
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست   ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی است

علامہ اقبال اپنے دیوان جاوید نامہ میں پیغام سلطان شہید بہ رود کاویری کی زیر عنوان حقیقت حیات و مرگ وشہادت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں، طویل نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

زندگی محکم ز تسلیم و رضا است   موت نیرنج و طلسم و سیمیا است
بندہ حق ضیغم و آہوست مرگ   یک مقام از صد مقام اوست مرگ
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر   مرگِ پورِ مرتضی چیزے دگر
جنگ شاہان جہاں غارت گری است   جنگ مومن سنت پیغمبری است
جنگ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست   ترکِ عالم اختیارِ کوئے دوست
آنکہ حرف شوق با اقوام گفت   جنگ را رہبانی اسلام گفت
کس نداند جز شہید ایں نکتہ را   کہ بخون خود خرید ایں نکتہ را

اقبال نے کم کسی شخصیت کے بارے میں اتنے اشعار کہے ہیں جتنے سلطان ٹیپو کی شخصیت کے بارے میں کہے ہیں، سلطان کی شخصیت ایسی جمیل وجلیل ''مردخدا کی دلیل اور یقین محکم کا پیکر'' تھی کہ اقبال کا فن ایک نظم سے مطمئن اور آسودہ نہ ہوتا تھا، یہاں ان کی ایک دوسری نظم پیش کی جارہی ہے جس سے سلطان کے ساتھ اقبال کے گہرے تاثر اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے:

آں شہیدان محبت را امام   آبروئے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تا بندہ تر   خاک قبرش از من و تو زندہ تر
عشق رازے بود بر صحرا نہاد   تو نہ دانی جاں چہ مشتاقانہ داد
از نگاہے خواجہ بدر و حنین   فقر سلطان وارث جذب حسین
رفت سلطان ایں سرائے ہفت روز   نوبت او در دکن باقی ہنوز

سلطان کے بارے میں اقبال کے دوسرے اور اشعار جاوید نامے میں دیکھے جاسکتے

ہیں، بہت سے دوسرے شعرا نے بھی عقیدت کے منظوم نذرانے پیش کیے ہیں، محمود شیرانی کی نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

زمین ہند سے اٹھا نہ کوئی فرزانہ   رہا یہ ملک ہمیشہ مطیع بیگانہ
بقدر ظرف جو ملتا کسی کو پیمانہ   دکھاتا کر کے وہ کچھ ہائے ہوئے مستانہ
جہاں نے ختم کیے دور ہائے سال دراز
ہوا نہ پیدا پٹھورا کا کوئی ہم آواز
وہ بادہ جس سے کہ سلطان لودی تھا مسرور   وہ آگ جس مراجل کے شیر شاہ سور
وہ نوش جس سے کہ مدہوش گیا تھا پور   اسی شراب نے ٹیپو کو بھی کیا مخمور
زمانہ گرچہ مخالف بھی پایا ٹیپو نے
کرے گا کون جو کچھ کر دکھایا ٹیپو نے
بہار گائیں گی جب بلبلیں گلستاں میں   خزاں کا دور ہو جب موسم زمستاں میں
حریف دو ہوں مقابل جب ایک میداں میں   اڑائیں ساغر مے جبکہ بزم یاراں میں
جہاں میں موسم ہے جب تک کہ شادی و ماتم
ہمیشہ روئے گا اس کے لیے سرنگاپٹم
ہزار اٹھ گئے دنیا سے بے پھلے پھولے   وہ ہونہار جو دنیا میں آئے اور نہ رہے
وہ تازہ غنچے جو مرجھا گئے بغیر کھلے   اسی طرح سے گیا ٹیپو بھی وقت سے پہلے
کہ اس کی موت ہی آئی شباب سے پہلے
پلایا زہر ہی اس کو شراب سے پہلے

ظفر علی خان کی وہ نظم جس کے اشعار مضمون کے شروع میں درج کیے گئے ہیں، فن کی حسن کاری اور مرصع کاری کا بیش بہا نمونہ ہے، اس نظم کے آخری دو شعر یہ ہیں:

میں نے کی عرض اے فطرت آزاد کی روح   توڑنی جس نے سکھائی ہیں غلامی کی قیود
بر زمینے کہ نشانے تو کف پائے بود   سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

سیماب اکبر آبادی کی طویل نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

ہند کی قسمت میں ہی رسوائی کا سامان تھا   ورنہ تو ہی عہد آزادی کا اک عنوان تھا
مصر سے تا روم پہونچی تیری آواز بلند   گونج اس کی اب بھی باقی ہے باانداز چند
اڑ رہے ہیں آج جو ماحول میں سیلاب کے   یہ بھی کچھ ذرے ہیں تیری خاک آتش تاب کے
اپنے ہاتھوں خود تجھے اہل وطن نے کھودیا   آہ کیسا باغ بان شام چمن نے کھودیا

آہنی پیکر ترا اب ہاتھ آسکتا نہیں
لے کے مشعل بھی کوئی ڈھونڈھے تو پاسکتا نہیں

روش صدیقی کی نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہند کو محرم ایثار وفا تونے کیا
حق وفاداری مشرق کا ادا تونے کیا
پرچم افشان علم دین خدا تونے کیا
حلقہ جادوئے افرنگ کو توڑا تونے
ہند میں پنجہ شیطاں کو مروڑا تونے

حریت سرخی نظم مہ و خورشید ہے پھر
انقلابات کی کچھ اور ہی تمہید ہے پھر
ہاں ترا عہد وفا عازم تجدید ہے پھر
پھر ہے بیدار جلال و حشم آزادی
وقت کے ہاتھ میں پھر علم آزادی

ہند میں آج جو جلوہ بیداری ہے
سطوت غیر جو مجبور نگوں ساری ہے
یہ ترے شعلہ ایثار کی گل کاری ہے
سر تکمیل ترا جذب تمام آپہنچا
صبح آزادی مشرق کا پیام آپہنچا

یہ شورش کاشمیری کی نظم ہے جس کا عنوان ہے "ٹیپو کے مزار پر":

اے رہ نورد شوق کہاں ہے کدھر ہے تو   کہتا ہے دیکھ کتبہ لوح مزار کیا
سن گوش حق نیوش سے آواز انقلاب   او بے خبر شکایت لیل و نہار کیا
مر کے بھی اس زمیں پہ کیے ثبت نقش پا   دیکھا نہیں لکھا ہے سر رہ گذار کیا
شہ رگ کا خون ہے عقدہ کشائے حیات و موت   اس شاہ رہ پہ زندگی مستعار کیا
شمشیر زرنگار سے ہے نظم کائنات   اس کے بغیر دغدغہ روزگار کیا
بے کار و بے سبب ہیں نواہائے دل گداز   ان شاخ چوں پہ نغمہ شوق ہزار کیا
خون جگر سے موج صبا ہے غزل سرا   خون جگر نہ ہو تو خزاں کیا بہار کیا
غیرت کی موت افضل و برتر ہے لاکلام   بکھرا پڑا ہے دیکھ یمین و یسار کیا
جب تک نہ زندگی کے حقایق پہ ہو نظر   تاریخ روزگار کے نقش و نگار کیا
ہمت بغیر سلطنت بحر و بر حرام   غیرت بغیر تاج شہی کا وقار کیا
جن کونپلوں کو باد خزاں نے کیا خراب   اب بھی ہے باغ باں پہ انہیں اعتبار کیا

کھلتے رہیں گے گردش دوراں کے پیچ و خم
بے معرکہ جئے تو خزاں کیا بہار کیا

اب ماہر القادری کے چند اشعار:

آخری ہچکی نے دی اللہ اکبر کی صدا   نزع کے لمحات میں بھی تونے کی باطل سے جنگ
تونے کی تجدید پیمان شہید کربلا   تونے بتلایا حفاظت جان کی ہے عذر لنگ
جان دی اور کس قدر مسرور ہو کر جان دی   موت تھی تیرے لیے گویا نگار شوخ و شنگ
تیغ کے جھنکار پر کرتی تھی تیری روح وجد   تیرے گوش و قلب تھے نا آشنائے عود و چنگ

وہ تو یہ کہیے کہ اپنے ہی پرائے ہوگئے
مٹ گیا تھا ورنہ سطح ہند سے نقش فرنگ

جن شاعروں نے سلطان ٹیپو کو محبت کا باج اور عقیدت کا منظوم خراج پیش کیا ہے، ان کی فہرست طویل ہے، ان میں اظہر امرت سری ہیں، فاخر ہریانوی بھی ہیں، اکبر وفاقانی بھی ہیں، لطیفی بھی ہیں اور بہت سے غیر مسلم شعرا بھی ہیں، یہاں تک کہ خود انگریز شاعر برڈ زاود کلف

نے بھی نوحہ غم لکھا جس کے پانچ بند ہیں، صرف پہلے بند کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

''خون کی اس عمیق رات میں اے اسلام کی شمع روشن تیرا شعلہ بجھا دیا گیا اور اقتدار شاہانہ کا عصا تیری قوم کے ہاتھ سے چھن گیا، تیری مسند جلال کے گرد بے شمار سچے اور جگر دار غازیوں کا جھرمٹ آج آفتاب کی شفق ریز شعاعیں اس پار پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر سے جھانکنے لگیں تو ان غازیوں میں سے صرف وہی رہ گئے جو آج تیرا ماتم کر رہے ہیں، اللہ اللہ اس حال میں کہ ہنگامہ کارزار کے خونیں بادل ہمارے سروں پر جھکے ہوئے ہوں موت بہتر ہے، اس رسوا کن زندگی سے جو سالہا سال کی اندوہ و انفعال کی سرمایہ دار ہو''۔

شعری انتخابات کے بعد کچھ نثری اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

۱- ''میں ایک حقیر انسان ہوں، میری حکومت اور وجاہت بھی مٹنے والی ہے، میری زندگی بھی ناقابل اعتبار ہے، تاہم میرا فرض ہے کہ جب تک زندہ رہوں وطن کی حفاظت اور آزادی کے لیے جہاد کرتا رہوں، ہزاروں آدمی وطن کے لیے موت کے گھاٹ اتر سکتے ہیں لیکن حب وطن کے جذبات کبھی نہیں مر سکتے''۔ (ٹیپو سلطان)

۲- ''اے میرے پیارے ہندوستان میری محبت اور میرا دل تیرے لیے ہے، میری حیات اور میرا وجود تیرے لیے ہے، میرا خون اور میری جان تیرے لیے ہے''۔ (سلطان ٹیپو)

۳- ''میں نے نصاریٰ (انگریز) کو فنا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، جو میرا مقابلہ کرنے کی تاب نہ لا سکے اور صلح کے خواہش مند ہوئے، اب میں نے پختہ ارادہ کر لیا ہے کہ انہیں ہندوستان سے نیست و نابود کر دیا جائے''۔ (سلطان ٹیپو کا خط شاہ عالم کے نام)

۴- ''میں بحر احمر کے کنارے پہنچ چکا ہوں اور آپ کو انگریزوں کے پنجہ سے چھڑانا چاہتا ہوں، آپ کسی معتمد قاصد کو قاہرہ بھجوا دیں تاکہ بات کر سکوں، خدا آپ کی طاقت بڑھائے اور دشمنوں کو تباہ کرے''۔ (نپولین کا خط ٹیپو کے نام)

۵- ''ٹیپو نے مندروں کے لیے بڑی فیاضی سے جائدادیں وقف کیں اور خود اس کے محل کے چاروں طرف مندروں کی موجودگی سلطان کی وسیع النظری اور رواداری کا ثبوت ہے''۔ (مہاتما گاندھی)

۶- ''ہندوستان کی تاریخ سلطان ٹیپو سے زیادہ بلند ہمت، بالغ نظر، مذہب و وطن کے فدائی اور غیر ملکی اقتدار کی دشمن سے آگاہ نہیں، انگریزوں کے لیے سلطان سے زیادہ مہیب اور قابل نفرت شخصیت کوئی نہ تھا، بہت عرصہ تک وہ اپنے دل کی آگ بجھانے اور آزادی و جہاد کے اس ہیرو کی تذلیل اور توہین کے لیے اپنے کتوں کو ٹیپو کے نام سے پکارتے تھے''۔ (مولانا ابوالحسن علی ندوی)

۷- ''سری رنگا پٹم اور بالاکوٹ جنگ کی وہ منزلیں ہیں جہاں مجاہدین نے سر سے کفن باندھ کر برطانوی استعمار کے خلاف جنگ کی تھی، ان مردان غازی کے کارنامے آج بھی چشم تصور سے دیکھے جا سکتے ہیں، تڑپتی ہوئی لاشیں، بہتا ہوا لہو، دمکتے ہوئے چہرے، دمکتی ہوئی روح''۔ (پروفیسر خلیق احمد نظامی)

۸- ''تاریخ بتاتی ہے کہ انگریزوں کو ان (ٹیپو) سے بڑھ کر کوئی اور حریف نہیں ملا، سلطان کی حکومت جنگ کے دوران شروع ہوئی اور جنگ کے دوران ختم ہوئی، سارے ہندوستان میں میسور ہی ایسی ریاست تھی جس نے انگریزوں کے خلاف ایک نہیں چار جنگیں لڑیں، جس نے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے، ان کے سپہ سالار بلبلا اٹھے یا تو کٹ گئے یا بھاگ گئے یا سری رنگا پٹم کے قید خانوں کی ہوا کھاتے رہے، سلطان واحد تاجدار تھا جو مسلسل اس رائے پر مصر رہا کہ ملک کی آزادی سے بڑھ کر کوئی شئی نہیں''۔ (پروفیسر بی شیخ علی)
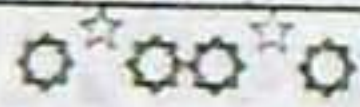
شیخ نورالدین احمد بن عبداللہ

اور ان کا

رسالۂ اخلاق سلطانی

از :- پروفیسر محبوب حسین احمد حسین عباسی ☆

احمد آباد کا کتاب خانہ درگاہ شریف حضرت پیر محمد شاہؒ نادر مخطوطات کا بیش بہا ذخیرہ ہے، اس کے ذخیرۂ کتب میں حال ہی میں ایک مجموعہ دست یاب ہوا ہے جو نویں صدی ہجری (پندرہویں صدی عیسوی) کے عالم، محدث، مصنف، شاعر اور صوفی شیخ نورالدین احمد بن عبداللہ ابی الفتوح الطاؤسی کے تین فارسی رسالوں پر مشتمل ہے (۱)، یہ ادبی، لسانی، دینی اور تاریخی اہمیت کے حامل اور بخط مصنف ہیں جس سے ان کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، قیاس یہ ہے کہ شیخ احمد طاؤسی جب گجرات تشریف لائے تھے تو یہ مخطوطہ بھی اپنے ساتھ ہی لائے ہوں گے۔

حکیم عبدالحئی نے اپنی مشہور عربی تصنیف "نزهة الخواطر و بهجة المسامع و النواظر" جواب "الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الاعلام" (۲) کے نام سے موسوم ہے، اس میں قدرے تفصیل سے اور اردو مقالہ یاد ایام (۳) میں مختصر طور پر مختلف عنوانات کے تحت شیخ احمد طاؤسی کے حالات درج کیے ہیں۔

شیخ احمد بن عبداللہ بن ابی الفتوح بن ابی الخیر بن عبدالقادر الحکیم الطاؤسی الشیرازی عالم اور عارف تھے، ان کو سید شریف جرجانی، شیخ شمس الدین محمد ابن الجزری اور شیخ مجدالدین فیروز آبادی جیسے محقق علما سے فخر تلمذ حاصل تھا اور صحیح بخاری کو بابا یوسف الہروی سے پڑھا تھا، شیخ احمد کی صحیح بخاری کی سند کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بہ اعتبار قلت وسایط کے اتنی عالی تھی کہ جب وہ

☆ سابق پروفیسر اور صدر شعبہ فارسی، اردو اور اسلامی ثقافت، گجرات کالج، احمد آباد۔

سند حجاز و یمن پہنچی تو وہاں کے بڑے بڑے محدثین نے اس کو شوق و رغبت سے حاصل کیا اور اس پر ہمیشہ فخر کرتے رہے۔

وہ سہروردیہ، کبرویہ، نعمۃ اللہیہ اور نقشبندیہ وغیرہ کے علاوہ شیخ محمد بن علی الملاسانی کے ہاتھ پر طاؤس الحرمین شیخ ابی الخیر کے سلسلۂ طاؤسیہ میں بھی بیعت تھے، حکیم عبدالحئی کے خیال میں سلسلۂ نقشبندیہ سب سے پہلے گجرات میں شیخ نورالدین احمد الطاؤسی کے ذریعہ ہی پہنچا، شیخ طاؤسی نے اپنے فارسی رسالوں کے ترقیموں میں اپنے آپ کو الاحمدی اور المرشدی بھی لکھا ہے (۴)۔

حکیم صاحب نے قطف الثمر و لطف السمر فی اعیان القرن الحادی عشر (نجم الدین غزی) ۲- حصر الشارد، ۳- الیانع الجنی یاد ایام میں گجرات میں محدثین کی تشریف آوری کے عنوان کے تحت بتایا ہے کہ مولانا نورالدین احمد شیرازی غالباً سلطان احمد شاہ اول کے عہد میں گجرات تشریف لائے تھے، گو شیخ نورالدین احمد کی گجرات میں آمد کا مفصل ذکر کہیں نہیں ملتا لیکن بعض اور شواہد سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، حکیم عبدالحئی کے بیان کے مطابق گجرات کے علامہ علاء الدین ابوالعباس احمد بن محمد النہروالی نے ان سے احادیث کی روایت کی تھی اور شیخ عبداللہ بن محمود الحسینی البخاری الگجراتی نے خرقہ حاصل کیا تھا، شیخ کے نواسے سید ہبت اللہ بن عطاء اللہ الحسینی الشیرازی ۸۹۸ھ/۱۴۹۳ (۵) میں اول گجرات کے تاریخی شہر چانپانیر معروف بہ محمد آباد میں اور بعد میں پایہ تخت احمد آباد میں آباد ہو گئے تھے اور یہ شاہ میر کے نام سے مشہور ہوئے اور انہوں نے شیخ نورالدین احمد طاؤسی سے احادیث بھی نقل کیں اور خرقہ بھی حاصل کیا تھا، شیخ نورالدین کے نو دریافت شدہ مجموعہ رسایل کے آخری ورق ۵۴ کے صفحہ ب پر ایک عبارت درج ہے جس کا بیشتر حصہ آب زدہ ہونے کی وجہ سے مٹ گیا ہے لیکن اس کی ایک سطر میں کسی نام کے ساتھ یہ الفاظ الدہلوی الگجراتی سلمہ اللہ پڑھے جا سکتے ہیں جو گجرات کے لوگوں کے ساتھ ان کے تعلقات پر دلالت کرتے ہیں، شیخ طاؤسی کے نواسے سید ہبت اللہ شاہ میر کے پوتے میر ابوتراب ولی (۶) نے شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں بڑا مقام حاصل کیا تھا اور فارسی میں تاریخ گجرات بھی تصنیف کی تھی مگر ان کے خاندان کے لوگ بعد میں احمد آباد سے کھمبایت منتقل ہو گئے تھے جہاں وہ اب تک آباد ہیں اور ان کے پاس خاندانی شجرہ بھی موجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ طاؤسی کی نسل کے لوگ اب بھی

گجرات میں موجود ہیں۔

شیخ احمد طاؤسی کی ولادت، وفات، ایران اور گجرات میں ان کے زمانہ قیام وغیرہ کے بارے میں تاریخیں خاموش ہیں، صرف اتنا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایران کے فرماں روا سلطان شاہ رخ میرزا (عہد سلطنت ۸۰۷-۸۵۰/۱۴۰۵-۱۴۴۷) اور گجرات کے مظفری خاندان کے حکمراں سلطان احمد شاہ اول (عہد سلطنت ۸۱۴-۸۴۵/۱۴۱۱-۱۴۴۲) کے ہم عصر تھے، شیخ کے ان خودنوشت فارسی رسالوں کے ترقیموں میں درج شدہ تالیف و کتابت کی تاریخوں: ۸۲۸، ۸۳۰، ۸۳۱ اور مقام کتابت کرمان اور شیراز کے اندراج سے یہ بات تیقن کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ نویں صدی ہجری کے ایک برگزیدہ اور صاحب فضل و کمال شخص تھے۔

شیخ نورالدین احمد طاؤسی ایران کے تیموری سلسلہ کے سلطان شاہ رخ مرزا (۷) کے اوصاف و محامد کے معترف تھے اور اس سے محبت و تعلق کی بنا پر اس کے لیے ایک مفصل رسالہ "اخلاق سلطانی" تصنیف کیا تھا مگر اس کا پتہ نہیں چلتا کہ سلطان شاہ رخ سے ان کی ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔

شیخ کے ہم عصر اور بعد کے متعدد علمانے ان سے حدیثیں روایت کی ہیں، اپنے نودریافت شدہ رسالہ اخلاق سلطانی میں انہوں نے چالیس معتبر احادیث جمع کی ہیں اور اپنے رسایل میں قرآن کریم کی بیسیوں آیتوں کو نقل کر کے ان کے معنی و مفہوم بیان کیے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عالم حدیث بھی تھے اور عالم قرآن بھی۔

شیخ کے رسالوں میں خود ان کے کہے ہوئے عربی و فارسی اشعار بھی درج ہیں جن میں عربی و فارسی میں الگ الگ نعتیہ قصیدے اور کئی نصیحت آموز قطعات بھی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بلند پایہ شاعر اور اچھے نثر نگار تھے، ان کا خط بھی پاکیزہ اور جاذب نظر ہے۔

اسفار حکیم عبدالحئی نے شیخ کے تذکرے میں ان کو الرحالہ کہا ہے، خود انہوں نے اپنے رسالہ اخلاق سلطانی میں سلطان شاہ رخ مرزا کے زیر حکومت علاقوں میں امن و امان کی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے کہ انہوں نے عرب و عجم میں دو ہزار فرسنگ کا سفر کیا تھا اور انہیں کسی رفیق سفر کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی (۸)، بعید نہیں کہ ان ہی اسفار کے دوران وہ گجرات

بھی آئے ہوں لیکن ان کے سفر کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔

تصانیف حکیم عبدالحئی نے لکھا ہے کہ "وله مصنفات ممتعه" لیکن صرف ایک ہی "رساله جمع الفرق لرفع الخرق" کا نام شیخ صفی الدین احمد القشاشی المدنی کی تصنیف السمط المجید کے حوالے سے لیا ہے لیکن خود شیخ نے رسالہ اخلاق سلطانی کے ورق ۳۰ ب کے حاشیے میں اپنی ایک کتاب خزانۃ اللآلی کا نام لیا ہے، یہ دونوں نایاب ہیں، اس لیے ان کے بارے میں کوئی رائے قایم نہیں کی جاسکتی، البتہ یہاں کتاب خانہ درگاہ شریف حضرت پیر محمد شاہ احمد میں محفوظ قلمی مجموعہ رسایل کا تعارف مقصود ہے۔

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے یہ مجموعہ ۵۴ اوراق پر مشتمل تین رسالے ہیں، تینوں کی زبان فارسی ہے، اس کے ورق ایک - الف پر یہ تحریر درج ہے: "مجموعہ حضرت ...... ولایت پناہ شیخ الشیوخ نورالدین ...... الفتوح قدس سرہ العزیز بخط قدس سرہ"، اس تحریر کے چند حروف مٹ گئے ہیں، اس کے قریب ہی خوب صورت مدور مہر ہے جو کوشش کے باوجود پڑھی نہیں گئی، اس میں پہلا رسالہ ورق ۱- ب سے ورق ۳۶ - الف تک چلا گیا ہے، دوسرا رسالہ ورق ۳۶ - ب سے ورق ۴۲ - الف تک اور تیسرا رسالہ ورق ۴۲ - ب سے ورق ۵۳ - ب تک کے صفحات پر منحصر ہے جب کہ آخری ورق ۵۴ - الف و ب پر بعض اہم تحریریں اور اشعار درج ہیں۔

رسالہ کا نام اخلاق سلطانی خود مصنف کا دیا ہوا ہے اور اس کا ذکر متن میں موجود ہے (۹)، یہ عجیب و غریب رسالہ مصنف کے ہم عصر سلطان شاہ رخ کے چند اوصاف حمیدہ کو اجاگر کرنے کی غرض سے لکھا گیا تھا، شروع میں حسب معمول حق سبحانہ و تقدس کی بارگاہ میں حمد و ثنا اور رسول اللہؐ کی شان میں تعریفی کلمات تحریر کرنے کے بعد بادشاہ وقت کی پرزور مدح سرائی کی ہے، ملاحظہ ہو:

> "آں بادشاہ دین پرور و آں سلطان دادگستر ...... معین السلطنت و الدنیا والدین الملخص بعنایۃ الملک المنان شاہ رخ بہادر خان ...... پناہ خلق جہاں بادشاہ ہفت اقلیم، معین دولت و دین سایۂ خدا شہ رخ (۱۰) ...... بادشاہی عادل، کامل، مشفق، منفق، رحیم، حلیم، بردبار، نیکوکار (۱۱) ......"۔

آگے ان خصایل کے بارے میں لکھتے ہیں:

''و آں حضرت گردون رتبہ را ۔۔۔ چہار صفت پسندیدہ و خصلت برگزیدہ ۔۔۔ از حضرت حق سبحانہ کرامت گشتہ کہ در آں ہر چہار تخلق باخلاق نبوی و اتصاف باوصاف مصطفوی حاصل آمدہ'' (۱۲)۔

دراصل بادشاہ کے اخلاق، رسول اللہؐ سے متصف ہیں، یہی حقیقت اس رسالہ کی تصنیف کا سبب ہے، اس کے بعد جو چار خصلتیں شمار کی ہیں، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے: ۱- جن علاقوں میں اسلام کی اشاعت ہوئی ہے وہاں شریعت کے احکام کے نفاذ کے لیے بادشاہ کی تلوار چمکتی رہتی ہے، ۲- حضورؐ کے اخلاق کی پیروی میں مسلمانوں کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ فرماتے ہیں، ۳- حکومت کی مشغولی کے باوجود دن میں روزہ اور شب میں آہ و زاری عادت شریفہ ہے، لوگوں کی حاجت روائی اور غم گساری کرتے ہیں، ۴- عوام کے لیے عطایا کا دروازہ کھلا رہتا ہے (۱۳)۔

ان چار خصلتوں کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ بندہ کو حق سبحانہ کی حفاظت میں رکھتی ہیں، ان کی فضیلت میں بے شمار حدیثیں ہیں، متن کے ساتھ حدیثوں کا فارسی ترجمہ بھی کیا ہے تاکہ لوگ ان سے فایدہ اٹھا کر اپنے اندر بھی یہ خوبیاں پیدا کریں (۱۴)۔

متعلقہ احادیث میں سے شیخ طاؤسی نے چالیس کا انتخاب اس بنا پر کیا ہے کہ بعض احادیث میں اس بات کی فضیلت وارد ہے، گو محدثین کے نزدیک یہ روایتیں پایہ اعتبار سے ساقط ہیں۔

جناب رسول اللہؐ کی چار صفتوں کو بیان کرنے کے لیے جن کا پرتو سلطان شاہ رخ کی ذات میں نظر آتا ہے، مصنف نے اس رسالہ کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے: ۱- باب اول در سلطنت و حکومت و ہیبت و حشمت حضرت سلطان سریر رسالت و پیغمبری، شہسوار میدان ایالت و سروری صلے اللہ علیہ وسلم، ۲- باب دوم در اخلاق کریمہ و اوصاف حمیدہ آں حضرتؐ، ۳- باب سوم در اہتمام آں حضرتؐ بگذاردن حاجات امت، ۴- باب چہارم در بذل و عطا و جود و سخا آں حضرتؐ۔

مصنف نے ان چاروں ابواب کے عنوان کی رعایت سے تمہید میں موضوع کی مفصل وضاحت کی ہے اور ہر باب میں دس دس حدیثوں کا عربی متن راویوں کے نام کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کے بعد ہر حدیث کا فارسی میں مفصل ترجمہ و مفہوم لکھ دیا ہے، اس کے ساتھ ایک

جدت یہ کی ہے کہ ہر حدیث کے فارسی ترجمہ کے ختم ہونے پر اس حدیث کے موضوع سے مناسبت رکھنے والے نعتیہ شعر کہے ہیں، ہر حدیث کے اختتام پر اس طرح کا ایک عربی اور ایک فارسی شعر ایک ہی وزن اور ایک ہی قافیہ و ردیف میں آیا ہے، یہ تمام اشعار مل کر چالیس اشعار کا ایک عربی نعتیہ قصیدہ اور چالیس اشعار کا ایک فارسی نعتیہ قصیدہ بن گئے ہیں، فارسی قصیدہ کا پہلا اور آخری شعر حسب ذیل ہے:

آن رسولی کہ بر آورد ز کفار دمار ۔۔۔ چتر وی ابر و جنودش ملکِ روحانی
احمد اگرچہ متاعت نبود در خور وی ۔۔۔ لیکن ایں قصہ بہ از ہر چہ تو آن برخوانی

رسالہ میں نقل شدہ حدیثوں کے ذریعہ مصنف نے رسول مقبولؐ کے بہترین اخلاق کی مثالیں پیش کی ہیں جو ہمیشہ قابل اتباع رہی ہیں، نمونہ کے طور پر باب دوم کی دو حدیثوں کا خلاصہ اور مفہوم لکھا جاتا ہے، اس باب کی چھٹی حدیث میں حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ میں حضورؐ کی خدمت میں دس سال رہا، آپؐ نے کبھی دل آزاری کی یا سخت بات نہیں کہی، اگر میں نے کوئی ناسزاوار کام کیا تو آپؐ نے یوں نہیں کہا کہ کیوں کیا؟ اگر مجھ سے کوئی فروگذاشت ہوگئی تو اس پر مجھ سے باز پرس نہیں کی، دسویں حدیث میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کو فرمایا کہ اے دوست سب کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ، چاہے کافر ہی کیوں نہ ہو کیوں کہ میں نے اس بات کا عہد کر رکھا ہے کہ جس کے اخلاق اچھے ہوں گے، اس کو قیامت میں عرش کے سایہ میں جگہ دوں گا اور حظیرۂ قدس سے پانی پلاؤں گا۔

راقم کے خیال میں اس رسالہ میں نقل شدہ تمام چالیس حدیثیں معتبر ہیں اور وہ جلیل القدر صحابہ سے مروی ہیں، مثلاً حضرت عایشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، امیر المومنین حضرت علیؓ، امیر المومنین حضرت عمرؓ وغیرہ۔

رسالہ اخلاق سلطانی میں چالیس چالیس اشعار کے عربی و فارسی نعتیہ قصیدوں کے علاوہ شیخ نے عربی اور فارسی میں قطعات اور مفرد اشعار بھی کہے ہیں، ان کی تعداد فارسی میں ۴۳- اور عربی میں ۷- ہے، جب کہ دیگر شعرا کے جو اشعار نقل کیے ہیں ان میں فارسی کے ۹- اور عربی کے ۱۲- ہیں، شیخ نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ رسول اللہؐ کے صحابی حضرت زہیرؓ نے بارہ نعتیہ اشعار

عربی میں کہے تھے، اس کے جواب میں اسی وزن اور قافیہ میں انہوں نے بھی بارہ شعر کہے تھے جو ان کی کتاب خزانۃ اللآلی میں محفوظ ہیں (۱۵)، علاوہ اس کے شیخ طاؤسی نے ۱۲-اشعار میں ان کو فارسی کا جامہ بھی پہنایا تھا، تین شعر حسب ذیل ہیں:

جانم فدات باد کہ از جان نکوتری	تنہا ترا رسد بہمہ خلق بہتری
منسوخ شد بہ دین تو ادیانِ سابقہ	از روی تست روشنی شاہ خاوری
فضل و کمال وجود بہ خلقت کمال یافت	شد ختم بر وجود تو حکم پیمبری

حضرت زہیرؓ نے جنگ حنین کے موقع پر رسول اللہؐ کو مخاطب کر کے عربی میں اور بھی بارہ شعر کہے تھے، شیخ نے ان اشعار کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا تھا، پہلا شعر یہ ہے:

ایا رسول خدا منتی ز روی کرم	بما بنہ کہ تو امید گاہ معتبری (۱۶)

شیخ احمد طاؤسی کے نعتیہ فارسی قصیدہ کے بھی بہت سارے اشعار پند و نصیحت آموز ہیں، مثلاً:

ساعتی کار خلایق بگذار و عمری	مزد طاعت بستان از کرم یزدانی
گر زرت نیست بمرگو نہ عدو باز گیر	روی خوش دار و بالفت بکشا پیشانی
گر نیازی نپذیری ز نماز تو چہ سود	آبرو گر طلبی آتشِ دل بنشانی
کار درویش گر امروز براری رتی	ورنہ فردا بودت حسرتِ نافرمانی

شیخ احمد طاؤسی کی فارسی نثر ان کی نظم کی طرح سادہ اور رواں ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر خاص اثر رکھتی ہے اور قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی، نمونہ کے طور پر شیخ کی زبانی ایک حدیث کا مفہوم نقل کیا جاتا ہے:

"دیدم حضرت پیغمبر را صلے اللہ علیہ وسلم در روز عید قربان کہ در جمرۃ العقبہ سنگ می انداخت در غایت بے تکلفی، باوی نہ حاجب و نہ دربان، نہ مردم را می زدند و از راہ وی دور می کردند، نہ قوتالی می انداختند نہ تازیانہ می افگندند، نہ دور باش پیشا پیش وی کہ مردم را براندنہ برو برو کہ حضرت سلطان می خرامد، مانند یکی از آحاد خلق و افراد مردم اعمال حج می گذارد و مجتنب بود از تکبر و تنعم" (۱۷)۔

مصنف نے فارسی کے چند متروک الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، جیسے می شنفشیدند (می شنیدند)

کاجکی (کاش کہ)۔

رسالہ اخلاق سلطانی کے خاتمہ کی دعا بھی قابل ذکر ہے:

"...... و مجموع خلایق را خاصہ کمترین بندگان درگاہ، احمد بن عبداللہ را از عدل تمام و بذل عامش حظی کامل و نصیبی شامل کرامت نمامی و در وقت سکرات و ہنگام غمرات، ایمان ہمہ را از وساوس شیطان در امان دار و ہمہ را با کمال ایمان بمیران و با کمال ایمان برانگیزان و در دنیا و عقبی با کمال ایمان دار، مصرع:
وین دعا را ز ہمہ خلق جہان آمین باد (۱۸)۔

ترقیمہ کی عبارت بڑی اہمیت رکھتی ہے جو حسب ذیل ہے (۱۹):

فرغ من تنمیق و تالیف تحریرہ و اتم تبییض تصنیف مسطرہ العبد الفقیر الی اللہ احمد بن عبداللہ الفتوحی الطاؤسی ثم الاحمدی ثم المرشدی عفا عنہم بیوم الاربعا السادس عشر من جمادی الاولی لسنہ احدی ثلثین و ثمانمائۃ والحمد للہ والصلوۃ والسلام علی محمد رسول اللہ۔

ترقیمہ کی عبارت صاف ہے کہ یہ رسالہ خود مصنف کا کتابت کردہ ہے، ویسے رسالہ میں اس بات کے اور بھی شواہد موجود ہیں کہ مصنف کا اس رسالہ کا یہ پہلا مسودہ ہے، کئی جگہ بلکہ ہر صفحہ پر مصنف نے اپنے قلم سے الفاظ اور عبارتوں میں ترمیم کی ہے یا فقروں کا اضافہ کیا ہے۔

شیخ احمد الطاؤسی کے زیر بحث مجموعہ رسایل کا دوسرا رسالہ مجہول الاسم ہے، اس کی تمہید یا خاتمہ میں یا کسی اور جگہ رسالہ کا نام یا اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

یہ رسالہ پہلے رسالہ اخلاق سلطانی کے ورق ۳۶-الف پر خاتمہ اور ترقیمہ کے بعد اسی ورق کے صفحہ ب پر شروع ہو جاتا ہے اور ورق ۴۲-الف پر ختم ہوتا ہے، اس میں چند دینی امور ذکر کیے ہیں اور وضاحت کے لیے کئی قرآنی آیات کو نقل کیا ہے، حمد و صلوات کے بعد ایک مسئلہ کی بحث ہے جو دلچسپ ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر حالت سُکر (بے ہوشی) میں کوئی خلاف شرع بات منہ سے نکل جائے تو اللہ تعالیٰ درگذر کرتے ہیں، کیوں کہ کسی جذبہ کے غلبہ کی وجہ سے وہ کلمات ظاہر ہوئے ہوتے ہیں، مثال کے طور پر حالت نماز میں اگر مصلی کی زبان سے کوئی اجنبی لفظ نکل جائے تو وہ نماز باطل ہو جاتی ہے لیکن بے اختیار ایسا ہوا ہو تو نماز ہو جاتی ہے۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کی خاطر مصنف نے شیخ حاجی امین الدین عبدالسلام خنجی اور قاضی القضات مولانا رکن الدین یحیی فالی کی ایک حکایت درج کی ہے، شیخ خنجی حالت نماز میں بے اختیار آوازیں نکالتے تھے، جب یہ مسئلہ مولانا رکن الدین کے سامنے پیش کیا گیا تو جواب دیا کہ شیخ امین الدین خنجی سے ایسا ہوتا ہے تو نماز صحیح ہے کیوں کہ غلبۂ حال کی وجہ سے اور بے اختیار ہوتا ہے لیکن اگر ان کے علاوہ کسی سے ایسی بات نماز میں ہو تو اس کی نماز باطل ہے، شیخ طاؤسی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کسی درویش سے ایسی حرکت صادر ہو تو طعن وتکفیر کے کلمات نہ نکالے جائیں۔

یہ مسئلہ بیان کرنے کے بعد ایک فلسفیانہ بات چھیڑی گئی ہے، ایک درویش یہ شعر پڑھا کرتا تھا ؎

ذاتی کہ درآن تصورت ممکن نیست   تصدیق چگونہ بی تصور باشد

یعنی اے اللہ تیری وہ ذات ہے جس کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اگر تصور نہیں کیا جاسکتا تو اس ذات کی تصدیق کس طرح ہو، شعر کہنے والے نے تصدیق کو تصور کے ساتھ جوڑ دیا ہے، شیخ کے خیال میں یہ منطقی بحث ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ذات کی تصدیق معرفت کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے، اس بحث کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر قناعت کی جائے اور تمام کاموں میں احکام شریعت کی پیروی کی جائے کیوں کہ اسی میں نجات ہے۔

اس مجہول الاسم رسالہ کا ترقیمہ بھی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ اس میں مصنف شیخ طاؤسی نے اس کی کتابت وتالیف کی تاریخ کے علاوہ مقام کا بھی ذکر کیا ہے، ترقیمہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

" قبض العنان من تحقیقه ووقع الفراغ من تنمیقه علی ید مملیه الفقیر الی الله احمد بن عبدالله ابی الفتوح بن ابی الخیر بن عبدالقادر الحکیم الطاؤسی ثم الاحمدی ثم المرشدی عفا عنهم ، فی لیلة السبت التاسع عشر من جمادی الاولی لسنة احدی و ثلثین و ثمانمایة بدار من بلدة شیراز بعد ما املیته ببلدة کرمان صانهما الله عن الحدثان فی غرة ربیع الآخر لسنة ثلثین وثمانمایة والحمد لله والصلوة والسلام علی

محمد رسول اللہ"۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف نے کرمان میں ۸۳۰ھ میں اس رسالہ کی تصنیف کی اور شیراز میں ۸۳۱ھ میں خود اس کی کتابت کی۔

اس مجموعہ کا تیسرا رسالہ ورق ۴۲-الف پر شروع اور ورق ۵۳-ب پر ختم ہوتا ہے، اوراد پر مشتمل اس رسالہ کا نام تحفۃ البررہ فی الاوراد العشرہ ہے، اس رسالہ میں بھی پہلے رسالہ کی طرح شیخ طاؤسی کے عربی اور فارسی اشعار پر مختصر قطعات شامل ہیں، ان کے علاوہ قرآنی آیات اور مسنون دعاؤں کے ساتھ ان کا فارسی ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے، اس رسالہ کی ترتیب اس طرح ہے کہ مصنف نے پہلے کسی تاریخی واقعہ کو پیش کیا اور پھر اس موقع کے مطابق دعا نقل کی ہے، اس طرح اس رسالہ میں کئی احادیث جمع ہوگئی ہیں، ایک بات قابل توجہ یہ ہے کہ طویل دعاؤں کو نقل کرنے کے بعد ان کا فارسی ترجمہ بین السطور سرخ روشنائی اور باریک خط میں لکھا ہے، سابقہ دو رسالوں کے مقابلہ میں یہاں ترمیم اور اضافہ بہت کم ہوا ہے، اس کی بھی کتابت خود شیخ طاؤسی کے خط میں ۸۳۱ھ میں ہوئی ہے جو ترقیمہ سے ظاہر ہوتا ہے:

ترقیمہ: وقد فرغ من تنمیقه بعون الله و توفیقه جامعه العبد احمد بن عبدالله ...... فی السادس والعشرین من جمادی الاول لسنة احدی و ثلثین و ثمانمایة۔

رسالہ اخلاق سلطانی کے دستیاب ہونے سے شیخ احمد طاؤسی جیسے نادر روزگار شیرازی عالم ومحدث کی یہ تصنیف جوان کی ہی کتابت کردہ ہے، منظر عام پر آئی ہے جس کی موجودگی کا علم ابھی تک غالباً کسی کو نہیں تھا۔

حواشی

(۱) حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف کتب خانہ، احمد آباد، عربی، فارسی، اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست، جلد ہفتم، کتاب نمبر ۱-۲۰۷ (۲) حکیم عبدالحئی، الاعلام بمن فی تاریخ الہند من الاعلام، الجزء الثالث، ص ۱۷ تا ۲۰ (۳) حکیم عبدالحئی، یاد ایام، مطبوعہ دہلی، ص ۴۷ و ۷۷، ۹۰، ۹۶، ۹۹ (۴) قلمی نسخہ، ورق ۳۶-الف اور ورق ۴۲-الف (۵) ہبت اللہ شاہ میر شیرازی کے لیے دیکھیے: حکیم عبدالحئی کی سابق الذکر "الاعلام" ص ۳۴۶، محمد غوثی شطاری

کی "گلزار ابرار"، ص ۲۱۵ و ۲۱۶، پروفیسر محبوب حسین عباسی کی "گجرات کے علماے حدیث و تفسیر"، مطبوعہ ۲۰۰۳ء، حاشیہ نمبر -۱۰۹ (۶) میر ابوتراب ولی کی فارسی تاریخ گجرات کا اردو ترجمہ گجرات اردو اکادمی، گاندھی نگر سے ۲۰۰۱ء میں شایع ہو چکا ہے، ہبت اللہ شاہ میر، میر ابوتراب ولی اور ان کے خاندانی حالات کے لیے دیکھیے اسی ترجمہ کا پیش لفظ بہ قلم پروفیسر جمال الدین شیخ، ص XX سے XXV (۷) قدیم و جدید مورخین کے مطابق سلطان شاہ رخ مرزا اپنے باپ امیر تیمور کے برخلاف اعلا انسانی صفات کا مالک تھا، دولت شاہ سمرقندی رقم طراز ہے: شاہ رخ بہادر... عدل بر دوام و شفقتی تمام در بارہ خواص و عوام داشتی... واز کمال طاعت و عبادت و پاکی طینت و اخلاق مرضیہ شاہ رخ سلطان را مقام و مرتبہ ولایت حاصل بودہ... لاشک پادشاہی کہ بعدل و داد و رواج شریعت روزگار گذرانیدہ، (تذکرۃ الشعرا، سال تصنیف در حدود ۸۹۲ھ مرتبہ محمد اقبال صافی، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۹، ۲۳۰) جدید دور کے ایک مورخ پرویز عباسی کی رائے میں: سلطان شاہ رخ پادشاہی بود کریم طبع و شجاع لیکن ہوای نفس و حب جاہ و نام در مزاج نداشت... علما را محترم داشتی و تحصیل علم را ترغیب و تحریص نمودی (تاریخ ایران از طاہریان تا عصر حاضر، جلد اول، ص ۱۵۹) (۸) شیخ احمد کے الفاظ حسب ذیل ہیں: "... واز آثار معدلتش یکی آنکہ امن و استقامہ و حضور و سلامۃ بمرتبہ است کہ در دو ہزار فرسخ از نواحی عرب و عجم کہ این فقیر حقیر دیدہ بود این مقدار چیزی لیسر و بعضی حقیر از ممالک محروسہ آں حضرت است ہرگز احتیاجی برفیقی نبود"، اخلاق سلطانی (قلمی)، ورق ۵ - الف، ایک فرسخ کی میزان ۸ - کلو میٹر یا ۳ - میل بتائی گئی ہے (فیروز اللغات) Steingass نے ۱۸۰۰۰ - فٹ لکھے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیخ نے ۱۶۰۰۰ - کلو میٹر یا ۶۰۰۰ - میل پیدل چل کر سفر کیے تھے (۹) قلمی نسخہ، ورق ۷ - الف، مصنف کی تحریر اس طرح ہے: "واین رسالہ را اخلاق سلطانی نام کردم"، لیکن یہ نام رکھنے سے پہلے مصنف نے تین اور نام تجویز کیے تھے مگر ان کو کاٹ دیے ہیں، سب سے پہلا نام اخلاق معینی لکھا، اسے کاٹ کر شمسی لکھا اور اسے بھی کاٹ کر فخری لکھا لیکن کسی نامعلوم وجہ سے آخر الذکر کو بھی کاٹ کر حاشیہ میں سلطانی لکھا ہے (۱۰) قلمی نسخہ، ورق ۴ - ب (۱۱) ایضاً ورق ۵ - الف (۱۲) ایضاً ورق ۶ - ب (۱۳) ایضاً ورق ۵ - ب ۹ - الف (۱۴) ایضاً ورق ۹ - ب (۱۵) ایضاً ورق ۳۰ - ب کا حاشیہ (۱۶) ایضاً ورق ۲۹ - ب (۱۷) ایضاً ورق ۱۳ - ب اور ۱۴ - الف (۱۸) ایضاً ورق ۳۶ - الف (۱۹) ایضاً

☆☆☆☆
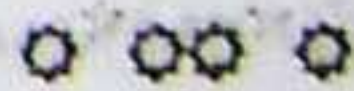
مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی

کے بعض افکار و خیالات

(شذرات معارف کے حوالے سے)

از:- ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ☆

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ملک کے مشہور صاحب قلم اور نامور مصنف تھے، ان کے علمی کارنامے اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ قومی، ملی اور ملکی مسایل و معاملات سے باخبر رہتے تھے اور ان کے بارے میں اپنا ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے گو ان کے ان افکار کی جھلک ان کی تصنیفات میں بھی نظر آتی ہے لیکن ان کے فکر و خیال کے زیادہ روشن نمونے ان کے شذرات میں ملتے ہیں، جن کے ذریعہ وہ برابر مسلمانوں کے قومی، ملی اور عالمی مسایل میں رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے اور جن سے ان کے قومی درد و سوز کا بھی پتہ چلتا ہے، ان کے شذرات کی خصوصیات، شہرت و مقبولیت اور اہمیت کو واضح کرتے ہوئے دارالمصنفین کے رفیق حافظ عمیر الصدیق ندوی دریابادی لکھتے ہیں:

"شاہ صاحب کے شذرات ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتے ہیں، قومی و ملی مسایل کا سامنا پھر قوم بھی کون... ؟ ہندوستانی، اور ملت بھی کیسی؟ اسلامی !! خون ٹپک ٹپک کر رہا، درد میں اضافہ ہی ہوتا گیا، مرثیے جدید نوحے ہو گئے، ان کے شذرات، پھر قوم کو دلاسہ، امت کو پرسہ، تشجیع و تحریض، جوش و ولولہ کے لیے ان کی کوششیں، فکری سلامتی اور ذہنی رشد کے آئینہ دار بن گئے، ان کے شذرات غیروں کی نیش زنی اور ایذا رسانی پر کس طرح مسکرا مسکرا کر درد کی شدت کو چھپا چھپا کر اپنا پیغام محبت پہنچاتے رہے"۔ (۱)

شاہ صاحب کے شذرات کی یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے وہ ہر طبقے اور ہر حلقے میں

☆ نایب مدیر الرشاد، اعظم گڈھ۔

قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے اور ادب و احترام سے پڑھے جاتے تھے، ان کے شذرات ہندوستان کے اس پر آشوب دور کی تاریخ بھی ہیں جس میں جد و جہد آزادی اپنے نقطۂ عروج پر تھی، ملک کو آزادی ملی، بعض ناعاقبت اندیشوں کی وجہ سے ملک کے حصے بخرے ہوئے، مسلمانوں کے ساتھ زیادتیاں اور ناانصافیاں ہوئیں، ان کی زبان ختم کی گئی، ان کی تہذیب پر حملے ہوئے، فرقہ وارانہ فسادات کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا، ان سب کی تفصیلات شاہ صاحب نے قلم بند کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ملک و ملت کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس کا ذکر انہوں نے نہ کیا ہو، یہاں اس کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ ان کے افکار و خیالات کا اندازہ ہو سکے۔

اردو: شاہ صاحب کا تعلق اودھ سے تھا اور ان کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی جہاں کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان بولی جاتی تھی، پھر شبلی اسکول کا اثر اور شاہ صاحب کا اپنا ادبی ذوق، ان کی زبان بڑی شستہ و شگفتہ اور دلآویز تھی جس سے انہیں عشق تھا، چنانچہ انہوں نے اردو ہی کو تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا اور آخر تک اس کی بقا و ترقی کے لیے کوشاں رہے۔

شاہ صاحب نے اردو کا دور عروج بھی دیکھا اور دور زوال بھی، انہیں کے عہد میں اردو ہندی تنازعے نے طول پکڑا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اردو کو دیس نکالا دے دیا گیا، غرض یہ کہ اردو کے ساتھ جو ناانصافیاں اور زیادتیاں اپنوں اور غیروں نے کیں وہ سب شاہ صاحب کے سامنے ہوئیں، اس لیے وہ اس کی زندہ تاریخ تھے اور یہ تاریخ انہوں نے معارف کے شذرات میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی ہے۔

آزادی کے بعد اردو کے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی، اسے ختم کر کے اس کی جگہ راتوں رات ہندی کو سرکاری زبان بنا دیا گیا، شاہ صاحب نے اس زیادتی کے خلاف سخت احتجاج کیا اور اردو کے مقابلے میں ہندی کو جن بنیادوں پر ترجیح دی گئی تھی اور اس کے لیے جو دلایل پیش کیے گئے، شاہ صاحب نے اسے ناقابل قبول قرار دیا اور لکھا کہ:

”قومی اور جمہوری حکومت نے اردو زبان کے ساتھ چند مہینوں میں جو سلوک کیا وہ غیر ملکی اور مستبد حکومت چند صدیوں میں بھی نہ کر سکتی تھی اور اس کے جواز کے لیے جو دلیل پیش کی جاتی ہے، اس کو نہ منطق سے واسطہ ہے نہ سچائی سے،

اسے کون منصف مزاج یقین کر سکتا ہے کہ صوبہ متحدہ کی اکثریت کی زبان ہندی اور اردو صرف ۱۴ فیصد کی زبان ہے، یہاں تک تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ علمی و ادبی اردو عام بول چال کی زبان اور شہری اور دیہاتی زبان میں فرق ہے لیکن صرف عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش تلفظ کی صحت و شایستگی اور لب و لہجے کا کوئی ایسا بنیادی فرق نہیں ہے جس کی بنا پر ان زبانوں کو بھی مختلف زبانیں کہا جائے چہ جائیکہ ہندو مسلم زبانیں قرار دیا جائے، زبان کی یہ تقسیم بالکل نئی ہے، شہر کے باشندوں کی زبان خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اسی طریقہ سے دیہات کے تمام باشندوں کی زبان بالکل ایک ہے، عام بول چال کی زبان ہندو مسلمان یکساں بولتے اور سمجھتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں جو زبان گڑھی جا رہی ہے، اسے صرف مسلمان بلکہ وہ ہندو بھی نہیں سمجھتے جو سنسکرت سے ناواقف ہیں“۔(۲)

آزادی کی تحریک میں اردو سے پورا کام لیا گیا، سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے، انقلاب زندہ باد وغیرہ نعرے ہر مجاہد آزادی کی زبان پر رہے مگر آزادی کے فوراً بعد اردو کی جگہ ہندی کو دے دی گئی، اس سلسلے میں شاہ صاحب کا موقف بہت واضح تھا، ان کا خیال تھا کہ ہندی ہندو کلچر کی نمایندہ ہے جب کہ اردو سیکولرزم کی نشانی ہے اس میں ہندو مسلم دونوں کے تہذیبی و ثقافتی عناصر پائے جاتے ہیں، اس لیے یہی ملک کی عام زبان ہونی چاہیے (۳)، انہوں نے اپنے ایک طویل مضمون ”اردو شاعری میں ہندو کلچر“ کی نشان دہی کی ہے جو ان کے ادبی مضامین کے مجموعے ادبی نقوش میں شامل ہے۔

دوسرے دانش وروں کی طرح شاہ صاحب بھی اردو کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان قرار دیتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اردو کو بنانے سنوارنے اور پروان چڑھانے میں ان دونوں قوموں نے دل و دماغ صرف کیے۔

مخالفین اردو اور ہندی کے ہم نواؤں کا خیال تھا کہ اردو کے ہوتے ہوئے ہندی کا چراغ نہیں جل سکتا، شاہ صاحب نے اس کی بھی تردید کی اور لکھا کہ اردو کے رہتے ہوئے اگر انگریزی اور دوسری علاقائی زبانیں ترقی کر سکتی ہیں تو ہندی کیوں ترقی نہیں کر سکتی. یہ ایک محض

مفروضہ ہے، اس کی تردید کے ساتھ انہوں نے اردو کی قومی، لسانی، تہذیبی اور تمدنی حیثیت واضح بھی کی اور حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر وہ اردو کا جائز حق نہیں دیتی تو اس سے متحدہ قومیت کو نقصان پہنچے گا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اردو کا مسئلہ درحقیقت سیاسی سے زیادہ قومی، لسانی اور تہذیبی اہمیت رکھتا ہے اور ہندو مسلم اتحاد، ہندوستان کے مشترک کلچر اور متحدہ قومیت کی سب سے بڑی نشانی ہے اور اس وصف میں ہندوستان کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور سب زبانیں مقامی اور صوبائی ہیں اور خاص خاص کلچروں کی نمایندگی کرتی ہیں اور اردو پورے ہندوستان کی ثانوی اور مشترک زبان ہے، اس میں اس کے تمام فرقوں اور طبقوں کے کلچر کی روح جھلکتی ہے، دلی، اترپردیش اور بہار وغیرہ کے علاوہ جن کی اردو مادری زبان ہے ان صوبوں میں بھی جن کی وہ مادری زبان نہیں ہے، کسی نہ کسی شکل میں رائج ہے اور ان کے دیہاتوں تک میں سمجھی جاتی ہے اور بڑے شہروں اور خاص علاقوں میں بولی بھی جاتی ہے اور مختلف صوبوں کے باشندوں کے درمیان افہام و تفہیم کا ذریعہ بھی یہی اردو ہے، اس کے علاوہ وہ ایک ترقی یافتہ اور مہذب زبان ہے، اپنا وقیع لٹریچر اور سنجیدہ علمی و ادبی ذخیرہ رکھتی ہے اور ایک بلند اور شایستہ کلچر کی مالک ہے، اس لیے ایک ایسی ترقی یافتہ زبان کو مٹانا جو اتنی گوناگوں خصوصیات کی حامل ہو نہ صرف تعصب و تنگ نظری ہے بلکہ علم وتمدن اور قوم و ملک کے ساتھ دشمنی ہے، اس سے متحدہ قومیت کو نقصان پہنچے گا، حکومت کا اعتبار اٹھ جائے گا اور اس کے سیکولرزم کے دعوے کی تردید ہوگی''۔(۴)

اردو کو ختم کرنے کی سرکاری سطح پر جو کوششیں کی جارہی ہیں، اس کی ابتدا شاہ صاحب کے عہد میں ہوئی اور جیسے آج رہ رہ کر اردو کے رسم الخط کو بدلنے کی باتیں بار بار اٹھائی جاتی ہیں، اسی طرح شاہ صاحب کے زمانہ میں بھی یہ شاطرانہ چالیں چلی جاتی تھیں اور جیسے آج رسم الخط تبدیل کرنے کے لیے اردو دشمنوں کو کچھ ہم نوا مل جاتے ہیں، اسی طرح اس وقت بھی بعض ہم نوا مل گئے تھے مگر شاہ صاحب اس کے سخت خلاف تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ رسم الخط بدلنے سے زبان

ہی بدل جائے گی، وہ لکھتے ہیں:

''اردو کو ختم کرنے کی جو تدبیریں کی جارہی ہیں، ان میں سب سے زیادہ خطرناک اس کا رسم الخط بدلنے کی تجویز ہے جو بظاہر اس کی ہمدردی میں کی جارہی ہے کہ اگر اس کا رسم الخط دیوناگری کردیا جائے تو ہندی والوں کی مخالفت ختم ہوجائے گی اور وہ اردو کو قبول کرلیں گے، اردو کے مخالفین کی طرف سے تو یہ تجویز سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے کسی جھگڑے کے بغیر خود اردو والوں کے ہاتھوں ان کا مقصد حاصل ہوجاتا ہے لیکن اردو کے نادان دوستوں کی طرف سے اس کی تائید عبرت انگیز ہے، یہ صحیح ہے کہ رسم الخط بدل جانے سے زبان ختم نہیں ہوجاتی لیکن اردو کی پوزیشن ایسی ہے کہ وہ ہندوستان میں صرف اپنے رسم الخط کی وجہ سے زندہ ہے، اردو ہندی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، دونوں کے قواعد ایک ہیں، مصادر ایک ہیں، ضمیریں ایک ہیں، بہت سے اسما مشترک ہیں، اگر اردو میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بڑھادیے جائیں تو وہ ہندی بن جائے گی، ہندی میں عربی و فارسی کے الفاظ بڑھادیے جائیں تو وہ اردو ہوجائے گی، دونوں میں مابہ الامتیاز صرف رسم الخط ہے اگر اردو کا رسم الخط دیوناگری کردیا جائے تو وہ چند دنوں میں ہندی کا قالب اختیار کرلے گی اور ہندی والوں کے رد و قبول کا سوال ہی باقی نہ رہ جائے گا''۔(۵)

شاہ صاحب رسم الخط کی تبدیلی کو اس لیے بھی مضر خیال کرتے تھے کہ اس سے زبانیں برباد ہوجاتی ہیں، اس کی متعدد مثالیں بھی انہوں نے پیش کی ہیں، خاص طور سے مصطفےٰ کمال کا ذکر کیا ہے کہ اس نے ترکی رسم الخط کو بدل دیا تو پوری ترکی قوم اپنے قومی ذخیرے سے بالکل بے بہرہ ہوگئی (۶)، اردو کے ساتھ حکومت اور ہندی والوں کے رویے کے ذکر کے سلسلے میں انہوں نے اردو طبقے کے ان سیاسی نمایندوں کی بے حسی کا بھی رونا رویا جو حکومت کے اداروں یعنی پارلیامنٹ اور اسمبلی میں موجود رہ کر بھی اپنے طبقے کے حقوق کے لیے مہر بہ لب رہتے تھے، ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو طبقے کی اس بے حسی اور بے اعتنائی کے متعلق شاہ صاحب کا انداز نظر کیا تھا اور اردو والوں کے اس رویہ کے بارے میں وہ کس درجہ حساس تھے:

''اردو کے بارے میں حکومت کی پالیسی کھلی ہوئی ہے، اس سے توقع رکھنا عبث ہے، افسوس کی بات یہ ہے کہ خود اردو کے بہت سے ہوا خواہ اس کی بقا و تحفظ کے لیے جو کچھ کرسکتے ہیں وہ بھی

نہیں کرتے، اس میں سب سے زیادہ شکایت پارلیامنٹ اور اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں سے ہے، دونج کی صحبتوں میں اردو کشی کا رونا روتے ہیں لیکن ان کو پارلیامنٹ، وراسمبلیوں میں لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی، ہندو ممبر تو کبھی کبھی اردو کی حمایت میں آواز بھی بلند کر دیتے ہیں، مسلمان ممبروں سے اتنا بھی نہیں ہوتا، اگر وہ متحدہ آواز بلند کریں تو اردو کے بہت سے حقوق مل جائیں''۔(۷)

اردو کے ساتھ اہل سیاست اور عام اردو داں طبقے کے طرز عمل کا ذکر بھی شاہ صاحب نے بڑے افسوس کے ساتھ کیا ہے جس سے ہمارا یہ خیال کہ اردو کو اردو والوں نے مخالفین اردو سے زیادہ نقصان پہنچایا کی تصدیق ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''آج اردو کے حامیوں سے کچھ کہنا ہے، ان کو اردو کے ساتھ حکومت کے طرز عمل کی شکایت بالکل بجا ہے لیکن اگر ان سے سوال کیا جائے کہ خود ان کا طرز عمل اردو کے ساتھ کیا رہا ہے اور انہوں نے اس کی کیا خدمت کی ہے تو ان کے پاس اس کا کوئی معقول جواب نہیں ہے، ہمارے ایک طبقہ کی اردو سے بے تعلقی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے بچوں کی اردو تعلیم کی جانب بھی توجہ نہیں کرتا، اونچے تعلیم یافتہ گھرانوں میں تو بسم اللہ انگریزی سے کرائی جاتی ہے، تقریر و تحریر، خط و کتابت اور گھر سے باہر اکثر و بیشتر گفتگو بھی انگریزی یا ایسی زبان میں ہوتی ہے جس میں پچاس فی صد سے زیادہ الفاظ انگریزی کے ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو محض مادری زبان کی حیثیت سے تو بولنا آجاتی ہے لیکن بہت سے تعلیم یافتہ اشخاص صاف اور سلیس اردو نہیں لکھ سکتے، ان کو خط لکھنے میں دشواری ہوتی ہے اور املا تک میں غلطیاں کرتے ہیں، اس کا مشاہدہ مغرب زدہ گھرانوں میں کیا جاسکتا ہے اور یہ پرانی داستان نہیں بلکہ آج بھی یہی ہو رہا ہے''۔(۸)

اپنوں کی اس بے اعتنائی کے باوجود شاہ صاحب برابر نہایت جوش اور سوز سے اردو کے لیے سرگرم رہے، حکومت بالخصوص اتر پردیش کی حکومت سے سیکولرزم اور جمہوریت کی دہائی دے کر اردو کے حقوق کے وہ مسلسل طلب گار رہے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حکومت نے اردو کے سلسلے میں بعض رعایتیں دینی چاہی تو شاہ صاحب نے ان رعایتوں کے بجائے اردو کے قانونی اور دستوری حقوق کی مانگ کی اور بڑے پتے کی بات لکھی کہ:

''اگر چہ اردو بھی لسانی اقلیتوں میں ہے اور ان کے مطالبات میں برابر کی شریک ہے مگر اس کی حیثیت دوسری لسانی اقلیتوں سے تھوڑی سی مختلف ہے، دوسری ریاستوں کو اپنی لسانی اقلیتوں سے وہ عناد نہیں جو اتر پردیش کی حکومت اور پورے عملے کو اردو کے ساتھ ہے، اس کی اردو دشمنی سب کو معلوم ہے، ایسی حالت میں جب تک تمام حقوق کا دستوری تحفظ نہ ہو جائے، اس وقت تک محض ان کی سفارش یا کسی افسر کے تقرر سے اردو کو فایدہ نہیں پہنچ سکتا اور اس خطرہ سے دوسری زبانیں بھی محفوظ نہیں رہ سکتیں بلکہ دستوری تحفظ کے بعد اس کے عملی نفاذ کے لیے کوشش اور نگرانی کی ضرورت ہوگی''۔(۹)

افسوس ملک کے دوسرے دانش وروں اور اردو کے ہمدردوں کی طرح شاہ صاحب کی بھی یہ تمام کوششیں رایگاں گئیں اور اردو کو اپنا جایز حق آج تک نہ مل سکا، حکومتیں بنتی بگڑتی رہیں مگر اردو محض وعدوں سے ہم کنار ہوئی۔

فارسی: شاہ صاحب اردو کے ساتھ فارسی زبان کی ترقی اور بقا بھی چاہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اردو کے لیے فارسی ضروری ہے کہ اس میں بیشتر الفاظ فارسی ہی کے ہیں، چونکہ فارسی ہندوستان میں ایک مدت تک حکومت کی زبان رہی، اس لیے فارسی زبان و ادب کے ذوق کو ختم ہوتے ہوئے دیکھ کر انہیں دکھ ہوا، چنانچہ جب انڈو ایران سوسایٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس نے چند برس میں اچھے سمینار اور علمی مذاکروں کا انعقاد کیا تو شاہ صاحب نے انہیں مشورہ دیا کہ:

''فارسی صدیوں تک ہندوستان کی علمی اور سرکاری زبان رہ چکی ہے، آج بھی اس کا جلوہ اردو میں نظر آتا ہے مگر اب اس زبان کا مذاق روز بہ روز ہندوستان سے ختم ہو رہا ہے، ایران سوسایٹی کا فرض ہے کہ اس کو زندہ رکھنے کی کوشش کرے، اس کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ ایران کی نئی مطبوعات کی فراہمی کا انتظام کرے...... یہ علمی خدمت بھی ہوگی اور اس کے ذریعہ فارسی زبان کے ساتھ کچھ نہ کچھ لگاؤ باقی رہے گا''۔(۱۰)

مسلم یونی ورسٹی: شاہ صاحب کا خیال تھا کہ مسلم یونی ورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک صدی کا قیمتی سرمایہ، عزیز متاع اور ان کے دل و دماغ کا سرچشمہ اور مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مرکز ہے، اس لیے بہر صورت اس کی شناخت کو باقی رہنا چاہیے، خاص طور سے حکومت

کو اس کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔

شاہ صاحب کو قوم وملت کے ہر بہی خواہ کی طرح مسلم یونی ورسٹی کے مسایل ومعاملات سے ہمیشہ دل چسپی رہی، وہ اس کی کورٹ کے ممبر بھی رہے، اس پر جب بھی کوئی افتاد پڑی یا کوئی الزام عاید کیا گیا یا حکومت کی طرف سے مداخلت کی گئی تو ان کا قلم نیام سے باہر آجاتا اور وہ سینہ سپر ہوجاتے، چنانچہ جب اس کے اقلیتی کردار کو مجروح کیا گیا تو شاہ صاحب نے بھی اس کے خلاف آواز بلند کی، پارلیامنٹ کے یونی ورسٹی دشمنوں کی سخت مذمت کی اور اسے فرقہ پرستی اور مسلم دشمنی سے تعبیر کیا، اسی طرح جب اس پر فرقہ پرستی کا الزام عاید کیا گیا تو انہوں نے لکھا کہ:

''جو لوگ مسلم یونی ورسٹی پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں، وہ ذرا اپنے گریباں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ہندو یونی ورسٹی میں مسلمان طلبہ کی تعداد کتنی ہے بلکہ ہندوؤں میں بھی ہریجن طلبہ کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے، ہندو یونی ورسٹی تو خیر ہندوؤں کی ہے اگر ان یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ کے اعداد وشمار فراہم کیے جائیں تو مشترک کہلاتی ہیں تو ان کی سیکولرزم اور فرقہ واریت کا سارا بھرم کھل جائے گا، اگرچہ زیدی صاحب نے اس الزام کی پوری تردید کی ہے کہ انجینئرنگ کالج کے طلبہ کی بڑی تعداد پاکستان چلی جاتی ہے لیکن اگر اس کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس میں طلبہ کا کیا قصور؟ جب ہندوستان کے مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے تقریباً بند ہیں تو ان کو جہاں بھی ملازمت ملنے کی امید ہوگی چلے جائیں گے، اس میں حکومت کا قصور ہے یا مسلمان طلبہ کا''۔(۱۱)

شاہ صاحب یونی ورسٹی کے اساتذہ، طلبہ اور اس کے اہل قلم پر بھی نظر رکھتے تھے اور انہیں مفید اور قیمتی مشورے دیا کرتے تھے، چنانچہ اہل قلم اور محققین کو مشورہ دیا کہ ان کی علمی تحقیقات محض تاریخی تحقیقات نہ ہوں بلکہ اسلامی تحقیقات ہونی چاہیے، وہ لکھتے ہیں:

''مسلم یونی ورسٹی اسلامی تہذیب وثقافت کی نمایندہ ہے، اس لیے اسلامیات کی تحقیق میں اس کا نقطۂ نظر تاریخی تحقیق کے ساتھ اسلامی بھی ہونا چاہیے اور اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تاریخ وتہذیب کو ان کی صحیح شکل میں اس طرح پیش کرنا چاہیے جس سے ان کی عظمت نمایاں اور دنیا پر اس کے مذہبی، علمی اور تمدنی اثرات ظاہر ہوسکیں، اس بارہ میں ہم کو ہندو فضلا سے سبق لینا چاہیے، جن کا ہر فرد اپنے اپنے دایرہ میں دنیا پر ہندو مذہب، ہندو فلسفہ اور ہندو تہذیب کا سکہ بٹھانے میں

لگا ہوا ہے، مسلمانوں کے پاس تو علوم وفنون کا پورا خزانہ ہے اور ان کے مذہبی، علمی اور تمدنی کارناموں کی ایک شاندار تاریخ موجود ہے، اس لیے اگر یونی ورسٹی کا یہ ادارہ اسلامی جذبہ سے اس کام کو انجام دے تو بڑی مفید خدمت انجام دے سکتا ہے''۔(۱۲)

ایک عالم دین کی حیثیت سے شاہ صاحب کو شعبۂ دینیات سے خصوصی دل چسپی تھی، ان کا خیال تھا کہ اس کو پوری اہمیت دی جائے ایسے اچھے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جن کی علمی و دینی شہرت مسلم ہو، ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس کے ذریعہ یونی ورسٹی میں دین کا وقار قایم ہونا چاہیے، وہ لکھتے ہیں:

''مسلم یونی ورسٹی مسلمانوں کا محض تعلیمی نہیں بلکہ قومی وملی ادارہ ہے، اس لیے اس کا شعبۂ دینیات باوقار ہونا چاہیے، اس کا کام محض مقررہ نصاب پڑھا دینا نہیں بلکہ یونی ورسٹی میں دینی فضا اور دین کا وقار قایم کرنا بھی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود یونی ورسٹی کے ارباب حل وعقد اس کی جانب توجہ کریں''۔(۱۳)

اور جب یونی ورسٹی پر کمیونسٹوں کا درپردہ غلبہ ہوا تو شاہ صاحب نے یونی ورسٹی کے ارباب حل وعقد کو آگاہ کیا کہ ان کا اثر روز بہ روز بڑھتا جاتا ہے، اس کا تدارک ہونا چاہیے۔(۱۴)

جامعہ ملیہ: علی گڑھ سے ہٹ کر ایک خاص مطمح نظر کی بنیاد پر جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا، شاہ صاحب اس کے بھی بڑے بہی خواہ تھے، چنانچہ انہوں نے حکومت کے سامنے تجویز پیش کی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو یونی ورسٹی بنایا جائے، شاہ صاحب کی یہ تجویز بہت پسند کی گئی، چنانچہ اس کی تائید وحمایت اخبارات ورسایل کے ساتھ انجمن ترقی اردو ہند نے بھی کی اور اسے ایک مثبت تجویز قرار دیا۔(۱۵)

جامعہ عثمانیہ: جامعہ عثمانیہ مادری زبان میں تعلیم کا پہلا کامیاب تجربہ تھا اور بہ قول شاہ صاحب ''اس کا اعتراف یورپ کی یونی ورسٹیوں تک کو کرنا پڑا'' بلاشبہ یہ مسلمانوں کا بڑا کارنامہ اور ان کی برسوں کی محنت وریاضت کا نتیجہ تھا مگر کسے معلوم تھا کہ یہ چشم زدن میں خاک میں مل جائے گا، آزادی کے بعد جب ریاست حیدرآباد کو ضم کیا گیا تو سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ اردو یونی ورسٹی کو ہندی میں تبدیل کردیا گیا، یہ زخم اتنا کاری تھا کہ ہر شخص نے درد محسوس کیا، شاہ صاحب جیسے محب اردو

کا قلم خون کے آنسو رویا جس سے معارف کے شذرات سرخ ہوگئے ہیں، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"جامعہ عثمانیہ کے ہندی یونی ورسٹی بنائے جانے کی خبر عرصہ سے گرم تھی، بالآخر یہ حادثہ ہو کر رہا، اس کا انتظام مرکزی حکومت کے ہاتھوں میں آجائے گا اور اس کا ذریعہ تعلیم ہندی زبان ہوگی، ہندوستان کا پورا نظام ہندیایا جارہا ہے اور رفتہ رفتہ تمام یونی ورسٹیوں کی تعلیمی زبان ہندی ہوجائے گی، اردو کی یونی ورسٹی صرف ایک جامعہ عثمانیہ تھی، اگر حکومت اس کو باقی رہنے دیتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا اور اس سے ہندی کو کیا نقصان پہنچتا مگر اردو دشمنی کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا اور اردو کی اس تنہا یونی ورسٹی کو بھی مٹا دیا گیا:

صبح تک تونے نہ چھوڑی وہ بھی اے باد صبا　　یادگار شمع تھی کل تک جو پروانے کی خاک

پرانے زمانے کے بعض فاتحوں کو آج صرف اس لیے غارت گر اور دشمن علم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مفتوح قوموں کے علمی ذخیروں اور تہذیب وتمدن کو مٹایا تھا، کیا جامعہ عثمانیہ کی یہ بربادی اس سے کم ہے بلکہ ان میں سے کچھ ایسے بھی نکل آتے ہیں جو مفتوح قوموں کے علوم سے فایدہ اٹھانے کے لیے ان کو محفوظ رکھتے تھے مگر ہماری حکومت کا کارنامہ ان غارت گروں سے بھی بڑھ گیا اور اس حکومت کے ہاتھوں انجام پایا جو جمہوری اور سیکولر کہلاتی ہے، جامعہ عثمانیہ کو ختم کردینا تو آسان ہے مگر تاریخ اس واقعہ کو فراموش نہ کرے گی اور آیندہ نسلیں اس "علم نوازی" کو عبرت کے ساتھ یاد کرتی رہیں گی"۔(۱۶)

دارالترجمہ حیدرآباد کو ہندوستان کے بیت الحکمت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کی تباہی و بربادی بھی شاہ صاحب کے عہد کا واقعہ ہے، اس بربادی پر شاہ صاحب کس طرح تڑپے ہیں اور کس طرح اپنے دردوسوز کا اظہار کیا ہے، ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

"بعض اخبارات سے یہ افسوس ناک اطلاع ملی ہے کہ دارالترجمہ حیدرآباد کی کتابیں اصل قیمت سے اسی فی صد سے کم پر فروخت ہورہی ہیں اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو اس کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے، وہ بیش قیمت علمی ذخیرے جو لاکھوں روپے کے صرف اور بڑے بڑے اصحاب علم و کمال کی برسوں کی محنت اور جاں کاہی کا نتیجہ تھا، جو اس طرح کوڑیوں کے مول اور ردی کے بھاؤ بک رہا ہے، کیا یہ واقعہ دور وحشت کے فاتحین کے ہاتھوں کتب خانوں کی بربادی کے واقعات

سے کم اہم اور درد انگیز ہے اور اگر یہ عذر ہے کہ اب حکومت کی زبان ہندی ہوگئی ہے، اس لیے اردو کتابوں کی ضرورت باقی نہیں رہی تو یہی عذر قدیم حکومتوں کے لیے بھی تھا کہ ان کی زبان مفتوح قوموں کی زبان سے مختلف تھی، اس واقعہ کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ کتب خانوں کی تباہی انسان کے دور جہالت کی باتیں تھیں، یہ سلوک تو اجنبی اور غیر ملکی حکومت نے بھی ملکی زبانوں کے ساتھ نہیں کیا تھا"۔(۱۷)

انجمن ترقی اردو ہند: انجمن ترقی اردو ہند کے پہلے سکریٹری علامہ شبلیؒ تھے، اس لیے شاہ صاحب کو بھی اس سے لگاؤ رہا اور وہ اس کے برابر رکن رہے، آزادی کے بعد جب ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ووٹ سے ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور اردو کو ملک کی دوسری زبان کا بھی درجہ نہیں دیا گیا بلکہ اس کی حیثیت علاقائی زبانوں سے بھی کم ٹھہری تو اس کے حقوق کے لیے جدوجہد کا آغاز ہوا، شاہ صاحب کا خیال تھا کہ اس تحریک کی قیادت انجمن ترقی اردو کو کرنی چاہیے، انہوں نے مشورہ دیا کہ:

"ہماری یہی رائے ہے کہ اردو کی موجودہ تحریک کی قیادت انجمن ترقی اردو کے ہاتھ میں رہنی چاہیے اور دوسرے اداروں کو اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہیے، اس لیے کہ اس میں اسی جماعت یا ادارہ کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں جو پہلے سے مستقل اور منظم ہو اور پبلک اور گورنمنٹ دونوں میں اس کو اعتماد حاصل ہو، یہ خصوصیات صرف انجمن ترقی اردو میں ہیں"۔(۱۸)

بعض لوگوں نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ انجمن نیم سرکاری ادارہ ہے، کہیں وہ حکومت سے راہ ورسم نہ اختیار کرلے، شاہ صاحب نے اس خدشہ کی بھی تردید کی اور لکھا کہ:

"انجمن کے متعلق یہ بدگمانی صحیح نہیں ہے کہ وہ نیم سرکاری ادارہ ہے، اس لیے ممکن ہے آیندہ ضرورت کے وقت وہ تیز قدم نہ اٹھا سکے اور کسی نازک مرحلے میں اس کام کو ادھورا چھوڑ کر الگ ہوجائے، اولاً یہ مہم صرف ایک قانونی وکالت ہے جس میں کسی انقلابی قدم کی ضرورت ہی نہ پیش آئے گی لیکن اگر بالفرض ایسا ہو بھی جائے تو انجمن پیچھے قدم نہیں ہٹا سکتی، اس لیے کہ اس تحریک کو ہاتھ میں لینے کے بعد اس کا وجود اس سے وابستہ ہوجائے گا، اگر وہ اس کام میں کسی قسم کی کم زوری دکھائے گی تو وہ ختم ہوجائے گی اور اب اردو کا مسئلہ قومی بن گیا ہے، اس لیے انجمن کی علاحدگی سے وہ ختم بھی نہیں ہوسکتا، اس لیے انجمن سے اس کو نقصان پہنچنے کا کوئی اندیشہ نہیں"۔(۱۹)

شاہ صاحب کے ان خیالات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں انجمن ترقی اردو سے
کس قدر لگاؤ تھا اور وہ اس پر کس درجہ اعتماد کرتے تھے۔

جمعیۃ علمائے ہند: جمعیۃ علمائے ہند نے ہندوستان کی آزادی میں بڑی قربانیاں دیں
اور اس سلسلہ میں اس کا بڑا شان دار ماضی ہے لیکن آزادی کے بعد وہ اپنا کردار بہ خوبی ادا نہ کرسکی،
اس کے بارے میں شاہ صاحب نے ایک بار لکھا کہ:

"جمعیۃ علمائے ہند کی بنیاد بڑی مقدس ہستیوں کے ہاتھوں پڑی اور اس کے کارناموں
کی ایک شان دار تاریخ ہے لیکن اس کا شان دار ماضی حال کے ہاتھوں تباہ ہورہا ہے"۔(۲۰)

مسلمانوں کی دل آزاری پر احتجاج: آزادی کے بعد فرقہ پرست اور فسطائی عناصر نے
مسلمانوں کی دل آزاری کو اپنا شیوہ بنالیا تھا، شاہ صاحب کے لیے یہ چیز ناقابل برداشت تھی، ان
میں دینی حمیت اور مذہبی غیرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اس لیے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف
جب بھی کوئی دل آزار بات سامنے آتی تو وہ فوراً اس کا نوٹس لیتے، اس کے خلاف صدائے احتجاج
بلند کرتے، ۱۹۵۶ء میں بھارتیہ ودیا بھون نے بیوگرافی آف ریلجس لیڈرس (Biography of
Religious Leaders) نامی کتاب شائع کی جس میں ازواج مطہراتؓ کی شان میں بے ہودہ،
ناشائستہ اور گستاخانہ کلمات لکھے گئے تھے، شاہ صاحب نے حکومت سے اس کتاب پر پابندی عاید
کرنے کا مطالبہ کیا اور حکومت کو متوجہ کیا کہ مسلمانوں کے مذہب، پیغمبر اور ان کی مقدس کتاب کی
توہین کا جو سلسلہ چل پڑا ہے اسے قانون بنا کر روکا جائے، اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح
ہوتے ہیں، انہوں نے متنبہ کیا کہ اگر یہ سلسلہ طویل ہوا تو ملک میں بدامنی پھیلے گی جو یقیناً حکومت
کے مصالح کے خلاف ہوگی۔(۲۱)

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا: بعض مغربی اہل قلم اور مورخین نے مسلمانوں پر یہ الزام
عاید کیا کہ انہوں نے اسلام کو تلوار کے زور سے پھیلایا، ان ہی کے زیر اثر ہندوستان کے بعض ہندو
اہل قلم نے بھی اپنی تحریروں میں اس بے سروپا الزام کو دہرایا لیکن حقیقت سے اس کا دور کا بھی
واسطہ نہیں اور اس کی تردید متعدد اہل قلم نے کی ہے کہ یہ مسلمانوں پر محض الزام ہے، شاہ صاحب نے
بھی اس ناروا الزام کی تردید کی ہے، البتہ شاہ صاحب کے دلایل زیادہ مضبوط ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"...... یہ تلوار کی قوت نہ تھی اگر تلوار کی قوت ہوتی تو کم سے کم اسلامی حکومتوں کے
دارالسلطنتوں کے علاقے پورے کے پورے مسلمان ہوتے یا ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی،
حالاں کہ آج بھی ان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے پھر ہندو جیسی قدامت پرست قوم سے اس کی
توقع بھی نہیں کہ وہ تلوار کے خوف سے اپنا مذہب بدل دیتی، حکومت کے اقتدار کا بھی اثر نہ تھا،
حکومت کا اقتدار صرف تہذیب وتمدن پر اثر انداز ہوتا ہے، ہزاروں برس کے راسخ عقیدہ کو نہیں
بدل سکتا، جب تک حکم راں قوم کے مذہب میں اثر ونفوذ کی صلاحیت نہ ہو، اس لیے یہ صرف اسلام
کی سادہ، فطری اور سچی تعلیمات کی تاثیر اور اسلامی اخلاق کی قوت تھی جس نے ہندوستان کے ہر
شعبۂ زندگی کو متاثر کیا، ہندوستان کی سرزمین توحید اور انسانی آزادی ومساوات کی پیاسی تھی، اس
لیے اسلام کے ابر کرم کا چھینٹا پڑتے ہی اس کی کھیتی لہلہا اٹھی، سیکڑوں استھانوں پر جھکنے والی
پیشانیاں ایک قدوس کے سامنے جھک گئیں"۔(۲۲)

بعض اہل قلم نے خاص طور سے ہندوستان کے مسلمان حکم رانوں کو نشانہ بنایا اور ان کے
ظلم وجبر سے اسلام پھیلانے کے فرضی واقعات لکھے تو شاہ صاحب نے ان کی بھی تردید کی اور لکھا کہ:

"ہندوستان کے مسلمان حکم راں تو مفت میں بدنام ہیں ان کو اپنی سیاست اور حکومت کی بقا
واستحکام کی فکر اور اپنے تعیشات سے اتنی فرصت اور اتنی توفیق کہاں تھی کہ وہ اسلام کی تبلیغ کرتے،
اگر انہوں نے اس کی جانب تھوڑی سی بھی توجہ کی ہوتی اور اعلا طبقہ کے ہندوؤں کی دل جوئی کی
جتنی کوشش کی، اگر اس کے عشر عشیر کوشش بھی ادنی طبقے کی دل جوئی کے لیے ہوتی یا اینٹ اور پتھر کا
تاج محل اور لال قلعہ بنانے کے بجائے اسلام کا اخلاق محل اور سبز قلعہ بنایا ہوتا تو آج ہندوستان کی
تاریخ کچھ اور ہوتی، یہ مانا کہ تاج محل مسلمانوں کی عظمت کا بہت بڑا نشان ہے لیکن اخلاق کا
تاج محل اس سے زیادہ پایدار نشان ہوتا"۔(۲۳)

ہندوستان میں اشاعت اسلام کیوں کر ہوئی، اس بارے میں خود مسلمانوں میں اختلاف
ہے، ایک حلقے کا خیال ہے کہ یہ فریضہ محدثین نے انجام دیا لیکن عام رائے یہ ہے کہ ہندوستان میں
اشاعت اسلام صوفیہ کی مرہون منت ہے، شاہ صاحب کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اکابر صوفیہ اسلام کا صحیح نمونہ اور اخلاق وروحانیت کا پیکر تھے، اس لیے ان کا فیض عام تھا

اور دوسری قوموں بھی ان سے متاثر ہوتی تھیں، چنانچہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت اور اس کی اخلاقی و روحانی اصلاح میں ان کا بڑا حصہ ہے، ان کے پیغام محبت نے ہندو مسلمان کو بھی ایک دوسرے سے قریب کیا، چنانچہ آج بھی ہندوستان میں تمام فرقے ان کی روحانی عظمت کے معترف اور ان سے دلی عقیدت رکھتے ہیں''۔ (۲۴)

اسلامی ہند کی تاریخ میں صوفیاے کرام کے مذہبی و اخلاقی کارنامے مسلمان سلاطین کے سیاسی کارناموں سے کم اہم نہیں ہیں، اگر ان بادشاہوں نے اپنی فتوحات سے اسلام کی شوکت و عظمت کا سکہ بٹھایا تو اقلیم روحانیت کے ان تاجداروں نے اپنے کردار و عمل سے اس کا عملی نمونہ پیش کیا اور اپنے اخلاق و روحانیت سے دلوں کی مملکت کو مسخر و منور کیا، اس لیے اسلام کی اشاعت میں سب سے بڑا حصہ ان ہی کا ہے''۔ (۲۵)

شاہ صاحب کا خیال تھا کہ جب خانقاہی نظام میں اخلاق و روحانیت کی بجائے بدعات و خرافات نے قدم جما لیے تو وہ اپنی افادیت کھو بیٹھے اور ان ہی بدعات و خرافات میں صوفیہ کے اصل کارنامے بھی دب گئے، اس لیے ان کی اصلاح کی ضرورت ہے، چنانچہ خود شاہ صاحب نے اس کی کوشش کی اور اپنے جد امجد شیخ احمد عبدالحق توشہ رودولوی کی خانقاہ میں جو بدعات و رسومات نے جگہ لے لی تھی، ان کی اصلاح کی۔ (۲۶)

اسی لیے دارالمصنفین نے صوفیاے کرام کے صحیح حالات و سوانح قلم بند کرنے کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کیا اور صوفیہ کے اصل کارنامے جو کشف و کرامات اور شطحیات میں گم تھے اور جن سے ان کی اصل تصویر سامنے نہیں آتی تھی، اس کے نقطۂ نظر کے مطابق جب جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے بزم صوفیہ لکھی تو اس پر شاہ صاحب نے بھی اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

مدارس اسلام کے قلعے ہیں: مدارس و مکاتیب کے سلسلے میں شاہ صاحب کا خیال تھا کہ ہندوستان میں یہ اسلام کے قلعے ہیں جو اس کی حفاظت و پاسبانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، ان کے علاوہ دوسری جماعتیں اور تنظیمیں اشاعت و حفاظت اسلام کی محض مدعی ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں اسلام اور اسلامی کلچر کی حفاظت کی مدعی تو بہت سی جماعتیں ہیں لیکن درحقیقت اس کی حفاظت و پاسبانی کا اصل فرض عربی مدارس ادا کرتے ہیں اور آج ہندوستان

میں دین و مذہب کا جو چرچا اور اسلامی کلچر کے جو نقوش بھی باقی ہیں وہ انہیں کی بدولت ہیں، اسلامی کلچر کے حفاظتی قلعے مسلمانوں کے پرشکوہ ایوان نہیں بلکہ غریبوں کے یہی جھونپڑے ہیں، گو مسلمانوں کی غفلت سے ان مدارس کو دنیاوی فراغت و اطمینان کے سامان بہت کم حاصل ہیں لیکن اس حالت میں بھی دین کی خدمت کا سررشتہ ان سچے خدمت گذاروں کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے اور وہ صبر و قناعت کے ساتھ برابر اپنا فرض ادا کرتے چلے جاتے ہیں''۔ (۲۷)

مدارس کے اساتذہ، طلبہ اور ذمہ داروں میں اتحاد و یک جہتی اور ہم آہنگی کی اہمیت و ضرورت سب پر عیاں ہے اور اس کے لیے کوششیں بھی کی جارہی ہیں، شاہ صاحب کو اس ضرورت کا احساس ۱۹۴۴ء ہی میں ہوگیا تھا، چنانچہ اس کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں اگرچہ مذہبی تعلیم کا رواج روز بروز کم ہوتا جاتا ہے لیکن خدا کو ایک جماعت سے دین کا کام لینا منظور ہے، اس لیے دینی تعلیم سے مسلمانوں کی غفلت کے باوجود الحمدللہ عربی مدارس کی کافی تعداد موجود ہے، ان سب کا مشترکہ مقصد دین اور دینی علوم کی خدمت ہے لیکن اس اتحاد مقصد کے باوجود ان میں باہم کوئی تنظیم اور اشتراک عمل نہیں ہے جو تعلیمی اور دینی دونوں حیثیتوں سے ضروری ہے، عموماً ایک مدرسہ کے طلبہ، مدرسین اور منتظمین دوسرے مدارس سے کوئی ربط و علاقہ نہیں رکھتے بلکہ ایک دوسرے کے حالات تک سے بے خبر ہوتے ہیں جس سے ان میں اتحاد و یگانگت کے بجائے اجنبیت اور دوری پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے تجربات اور مفید مشوروں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے''۔ (۲۸)

مورخین کو مشورہ: انگریزوں نے ہندوستان کی جو تاریخیں لکھیں، اس میں بالقصد ایسے واقعات لکھے جن سے ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان منافرت کے جذبات پیدا ہوں اور اتحاد و یگانگت کے بجائے اختلاف و انتشار پیدا ہوا اور وہ کبھی متحد نہ ہوسکیں، ان کے زیر اثر بعض ہندو مورخین نے بھی تاریخ نویسی میں یہی روش اختیار کی، آزادی کے بعد بھی جب یہ سلسلہ جاری رہا تو شاہ صاحب نے ملکی مفاد و استحکام اور سالمیت کے پیش نظر اس طرز عمل کو ناپسندیدہ قرار دیا اور لکھا کہ:

''اب ایک نیا آزاد ہندوستان تعمیر ہو رہا ہے، اس لیے غلامی کے دور کے بہت سے تصورات اور سوچنے کے طریقوں کو بدلنے کی ضرورت ہے، جس میں تاریخ بھی شامل ہے، اب

محض تاریخ نگاری کا نہیں بلکہ تاریخ سازی کا دور ہے اور اس کی ذمہ داری ہمارے مورخین پر ہے کہ وہ ایسی تاریخیں لکھیں جو قومی وحدت اور ہندوستان کی ترقی و استحکام کے لیے مفید ہوں نہ کہ اس کو نقصان پہنچائیں ، ایسی تاریخیں لکھنا جس سے ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اختلاف و عناد پیدا ہو ملک کے ساتھ دشمنی ہے''۔(۲۹)

شاہ صاحب کا خیال تھا کہ انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے اسلامی عہد کی تاریخ عمداً غلط رنگ میں پیش کی مگر آزادی کے بعد اس طرز عمل کو روا رکھنا کسی طرح درست نہیں ، وہ لکھتے ہیں:

'' آزاد اور قومی حکومت کے زمانہ میں اسی پرانی روش پر قایم رہنا اور تاریخوں میں ایسی باتیں لکھنا جس سے مسلمانوں یا کسی فرقہ کی دل آزاری ہوتی ہو کہاں تک مناسب اور ہندوستان کے مفاد کے مطابق ہے ، افسوس ہے کہ بڑے بڑے ہندو مورخین کا دامن بھی اس سے پاک نہیں ہے اور مسلمانوں کے متعلق ان کے قلم پر جو بھی آجاتا ہے لکھ جاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا اثر ہندوستان پر کیا پڑے گا''۔(۳۰)

شیعہ سنی اختلافات: شاہ صاحب مذہبی اختلافات کو سخت ناپسند کرتے تھے ، ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی اختلاف و انتشار سے ہمیشہ ان کی قوت کو نقصان پہنچا ، مسلمانوں کے سیاسی زوال کو بھی شاہ صاحب اختلافات ہی کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔(۳۱)

انھوں نے شیعہ سنی دونوں کو ان اختلافات سے احتراز کرنے کا مشورہ دیا اور متنبہ کیا کہ اگر اس کے نقصانات وہ نہ سمجھے تو ایک روز حالات خود انھیں اس کے نتایج سمجھنے پر مجبور کردیں گے۔(۳۲)

زمین داری: ہندوستان میں زمین داری کا نظام مسلمانوں کے عہد میں قایم ہوا ، انگریزوں نے بھی اسے باقی رکھا ، آزادی کے بعد یہ نظام یک لخت ختم کردیا گیا ، شاہ صاحب نے حکومت کے اس قدم کو سخت ناپسند کیا اور لکھا کہ:

''ہندوستان کے انقلاب اور جمہوری حکومت سے جہاں بہت سے فواید پہنچے وہاں ایک بڑا نقصان بھی ہوا ، وہ ہندوستان کے پس ماندہ طبقوں کو اونچا کرنے میں تو بڑا کام کررہی ہے لیکن زمین داری ختم کرکے اس نے صوبے کے سیکڑوں قدیم اونچے خاندانوں کو بالکل تباہ کردیا ، یہ صحیح

ہے کہ اس عوامی اور جمہوری دور میں زمین داری کا پرانا نظام قایم نہیں رہ سکتا اور خود اس طبقہ میں بھی زوال کے سارے اسباب فراہم ہوگئے تھے لیکن اس کو سنبھالنا اس کا فرض تھا اور وہ دوسرے ذرایع سے اس کی زندگی کا سامان کرسکتی تھی جو لوگ دوسروں کی پرورش کرتے تھے ، آج وہ خود کوڑیوں کے محتاج ہیں ، یہ طبقہ اپنی بعض خرابیوں کے بعد قدیم تہذیبی روایات کا محافظ اور اس کا نمایندہ تھا ، اس کے ذریعہ ہمارے بہت سے علمی ، تعلیمی اور مذہبی ادارے پرورش پاتے تھے ، ان کے ساتھ ان سب پر بھی زوال آگیا ، اس انقلاب کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر پڑا ہے''۔(۳۳)

تعلیم: شاہ صاحب کے فکر ونظر کا ایک اہم پہلو تعلیم تھی جس پر وہ برابر لکھتے رہے ، ان کا خیال تھا کہ:

'' قوموں کی تعمیر و تشکیل میں تعلیم کو سب سے زیادہ دخل ہے ، اس سانچہ میں ملک کے نوجوانوں کے دل و دماغ ڈھلتے ہیں اور اسی گہوارہ میں ان کے خیالات و نظریات نشو و نما پاتے اور بنتے بگڑتے ہیں اور وہ یہاں سے جو افکار و تصورات لے کر نکلتے ہیں ، ان کا نقش کبھی نہیں مٹتا اور انھیں کے مطابق ان کی قومی سیرت و کردار کی تشکیل ہوتی ہے ، اسی لیے قومی زندگی میں تعلیم اور بالخصوص ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت اہم ہے''۔(۳۴)

ان کے نزدیک مسلمانوں کی دینی تعلیم کا مسئلہ ان کی ملی موت و حیات کا مسئلہ تھا کہ اگر انھوں نے اس سے لاپروائی اور غفلت برتی تو آیندہ نسلیں محض نام کی مسلمان رہ جائیں گی (۳۵) ، ان کا یہ بھی خیال تھا کہ نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے جس سے قوم کی دماغی اور ذہنی نشو و نما ہوسکے ، اسی لیے وہ ہندوستان میں انگریزوں کے نظام تعلیم کو پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ روح سے خالی تھا اور اس کا مقصد محض کلرک پیدا کرنا تھا تاکہ حکومت کا کام بہ آسانی چل سکے (۳۶)۔

آزادی کے بعد جب جمہوری حکومت نے اپنا نظام تعلیم نافذ کیا ، جس میں مسلمانوں کی تعلیمی و تہذیبی خصوصیات کا خیال نہیں رکھا گیا تھا تو شاہ صاحب نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اب مسلمانوں کو اپنے تشخص وبقا کے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اپنے مدارس و مکاتب قایم کریں ورنہ مستقبل میں اس کے نتایج اچھے نہ ہوں گے اور وہ اپنی مذہبی حمیت اور دینی غیرت گنوا بیٹھیں گے (۳۷)۔

صحافت: ذرایع ابلاغ و ترسیل (Media) کو جو اہم مقام آج حاصل ہے ، اس سے

اہل علم بہ خوبی واقف ہیں لیکن ساٹھ برس پہلے بھی اس کی اہمیت کم نہ تھی، اس وقت شاہ صاحب نے وضاحت سے لکھا تھا کہ اخبارات کو قوموں کو بگاڑنے اور بنانے میں بڑا دخل ہے، صالح اور مفید لٹریچر، مذہبی جلا اور دماغی روشنی کے لیے ضروری ہے (۳۸)، اس اہمیت کے پیش نظر وہ ترقی یافتہ ممالک کی مثالیں دے کر لکھتے ہیں:

''آج دنیا میں سب سے بڑی قوت پریس کی ہے، اس کے بغیر کوئی آواز موثر نہیں ہوسکتی اور ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی انگریزی اخبار نہیں، اردو کے اخبارات کی کوئی آواز نہیں، ان کی آواز خود ہندوستان کے ایک بڑے طبقے تک نہیں پہنچتی بیرونی دنیا کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے جو سب سے زیادہ ضروری اور موثر چیز ہے''۔ (۳۹)

انگریزی اخبار کی ضرورت کا احساس آزادی کے بعد اہل علم و دانش میں بہت بڑھ گیا تھا تاکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تحریروں کا جواب لکھا جائے اور اسلام کی صحیح تعلیمات سے انگریزی داں طبقہ کو واقف کرایا جائے، جیسا کہ اوپر گذرا، شاہ صاحب بھی انگریزی اخبار کی اشاعت ضروری خیال کرتے اور اس کی طرف وہ برابر توجہ دلاتے رہے، ۱۹۵۲ء میں جمعیۃ علما نے ''میسیج'' (Message) کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار جاری کیا تو شاہ صاحب نے اس کا ذکر معارف کے شذرات میں کیا اور لکھا کہ:

''مسلمانوں کے لیے ایک روزانہ اخبار کی جس قدر ضرورت ہے وہ ظاہر ہے مگر آج تک ان کو اس کی توفیق نہیں ہوئی، اس ضرورت کے پیش نظر جمعیۃ علما نے میسیج (Message) کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا ہے اگرچہ کچھ نہ ہونے کے مقابلہ میں یہ بھی غنیمت ہے مگر اصل ضرورت روزانہ اخبار کی ہے، ہندوستان میں ہندوؤں کے درجنوں اور پاکستان میں مسلمانوں کے کئی انگریزی روزنامے نکلتے ہیں، ایسی حالت میں ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کے لیے ایک انگریزی اخبار کا چلانا کیا مشکل ہے، وہ اپنی شکایتوں کے لیے زبانی شور و غوغا تو بہت کرتے ہیں مگر ان کے ازالہ کی صحیح تدبیر اختیار نہیں کرتے، اگر وہ صرف اتنا کریں کہ پیسہ خرچ کرکے انگریزی کے زہریلے فرقہ پرست اخبارات کی گالیاں سننے کے بجائے میسیج (Message) کے خریدار بن جائیں تو کسی اور امداد کے بغیر وہ آسانی سے روزانہ بن سکتا ہے''۔ (۴۰)

آج اگر ہم گزشتہ پچاس برس کی مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ افسوس ناک حقیقت سامنے آئے گی کہ اس سلسلہ میں چند کوششوں کے سوا مسلمان کچھ نہ کرسکے انگریزی کا اخبار تو درکنار اب مسلمانوں کا اپنا کوئی اردو اخبار بھی نہیں جو ان کے مسایل و مشکلات اور ان کے خیالات کی ترجمانی کرسکے۔

ترقی پسند ادب: ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا گو تحریک کے بعض افکار و نظریات کی وجہ سے اسے بڑی مقبولیت ملی تاہم بعض ترقی پسندوں نے ترقی پسندی کے نام پر ادب میں عریانیت اور فحش نگاری کو رواج دینا شروع کیا، شاہ صاحب نے اسے مخرب خلاق اور ادبی گم راہی قرار دیا چوں کہ اس کی ابتدا لاہور سے ہوئی تھی، اسی لیے پنجاب کے اہل قلم کو خاص طور سے اس کی طرف متوجہ کیا اور لکھا کہ:

''ترقی پسند ادب کی عریاں نویسی اور فحش نگاری کے متعلق معارف میں لکھا جاچکا ہے اور ہندوستان کے بہت سے سنجیدہ اصحاب علم اور اہل قلم حضرات نے بھی اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں لیکن یہ وبا برابر پھیلتی جاتی ہے، اس پست اور مخرب اخلاق لٹریچر کی اشاعت میں پنجاب کے بعض ادبی رسالوں کا قدم سب سے آگے ہے اور انہوں نے ادب لطیف کے پردہ میں ادب کثیف کی اشاعت کو مستقل مقصد بنالیا ہے جس کو کوئی سنجیدہ انسان پڑھ نہیں سکتا۔

پنجاب خصوصاً لاہور ہندوستان میں اردو ادب کی اشاعت کا سب سے بڑا مرکز ہے لیکن افسوس وہاں کے برعکس نام نہند ترقی پسند ادیب اپنی نافہمی سے اس کے امتیاز کو داغ دار بنا رہے ہیں، ناصاف آبادی کے اژدحام میں جہاں وبا کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے، حفظان صحت کے اہتمام کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے، اس لیے پنجاب کی ادبی پیداوار کی نگرانی کی بڑی ضرورت ہے اور یہ فرض سب سے زیادہ وہاں کے سنجیدہ اصحاب قلم پر عاید ہوتا ہے جن کی لاہور میں کمی نہیں، وہاں زمین شعر و ادب کے زمین دار بھی ہیں، آسمان صحافت کے مہر بھی ہیں، راہ ادب کے سالک بھی ہیں، کثافتوں کی تطہیر کے لیے زمزم و کوثر بھی موجود ہیں، ان کی موجودگی میں یہ ادبی گم راہی حیرت انگیز ہے، اس کے نوک قلم میں بڑے بڑے فاسد ماروں کو خارج کردینے کی قوت ہے، یہ ادبی فساد نو ان کی ادنی توجہ سے دور ہوسکتا ہے''۔ (۴۱)

قومیت اور وطنیت : قومیت اور وطنیت کا جو تصور یورپ نے پیش کیا ہے، شاہ صاحب اسے سخت ناپسند کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس تصور حیات کا لازمی نتیجہ جارحیت کے شکل میں ظاہر ہوگا، وہ لکھتے ہیں۔

"اپنی قوم اور وطن سے محبت بالکل فطری اور ان کے حقوق کی ادائیگی ایک فریضہ ہے، اسی لیے مذہب نے بھی اس کی تعلیم دی ہے لیکن یورپ نے جس قومیت اور وطنیت کا صور پھونکا ہے اور اس کو پرستش کی حد تک پہنچادیا ہے، اس کا لازمی نتیجہ جارحیت ہے یہ قومیت اور وطنیت محض اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت و ہواخواہی تک محدود نہیں بلکہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں اس کی سیاسی و معاشی برتری بھی ضروری ہے، اس کا لازمی نتیجہ اقوام عالم میں کشمکش اور کم زور قوموں کی پامالی ہے کہ اس کے بغیر برتری حاصل نہیں ہوسکتی، خود یورپ میں اس نیشنلزم نے کیسی کیسی لڑائیاں برپا کیں، موجودہ بڑی قوموں کی ساری کشمکش اسی کا نتیجہ ہے اور اب یہ دیوانا بے قابو ہوگیا ہے کہ بقائے باہم اور پنچ شیل کی کم زور زنجیروں سے قابو میں نہیں آتا"۔ (۴۲)

شاہ صاحب زندگی کے مادی تصور اور مادی نصب العین کو انسانیت کی ترقی کے لیے مضر خیال کرتے تھے، ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جب تک یہ مادی تصورات نہ بدلیں گے قوموں میں باہم اعتماد اور ایک دوسرے کے تئیں ہم دردی پیدا نہیں ہوسکتی اور اس تصور اور اس سے پیدا تمدن کا سب سے بڑا خسارہ شاہ صاحب کے نزدیک یہ تھا کہ اس نے انسان کو اعلا درجہ کا ترقی یافتہ حیوان بنادیا ہے۔ (۴۳)

اسی طرح شاہ صاحب امپریلزم کو بھی سخت ناپسند کرتے تھے۔ (۴۴)

کمیونزم: شاہ صاحب کے نزدیک کمیونزم بھی ایک ناپسندیدہ نظریہ حیات تھا، ان کا خیال تھا کہ یہ دنیا کے لیے فتنہ ہے اور اس کی بنیاد خالص مادیت اور خودغرضی پر مبنی ہے (۴۵)، اسٹالن کے بارے میں انہوں نے لکھا کہ وہ اور اس کا نظام خدا کا منکر ہے۔

اسٹالن پوری زندگی خدا کا مذاق اڑاتا رہا، جب وہ مرض موت میں گرفتار ہوا اور صحت کی ساری تدبیریں کام نہ آئیں تو اس کے لیے خدا سے دعا مانگی جانے لگی، شاہ صاحب نے معارف کے ایک شذرے میں اس پر بڑی لطیف تنقید کی کہ ایک ذرا سی ٹھوکر میں خدا یاد آنے لگا۔ (۴۶)

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

کمیونسٹوں کے بارے میں شاہ صاحب کی بڑی سخت رائے تھی، انہوں نے لکھا کہ "کمیونسٹ نہ صرف مذہب و ملت کے دشمن ہیں بلکہ ملک و وطن کے وفادار بھی نہیں اور کمیونزم کی قربان گاہ پر ہر چیز کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں"۔ (۴۷)

آزادی: شاہ صاحب آزادی اور جمہوریت کو خدا کی عطا کردہ نعمت خیال کرتے تھے لیکن اس کے لیے عدل و انصاف کو بھی وہ لازمی گردانتے تھے، ۲۶/ جنوری ۱۹۵۰ء میں جب آئین کا نفاذ عمل میں آیا تو شاہ صاحب نے لکھا کہ:

"آزادی اور جمہوریت خدا کی نعمت ہے جو ان ہی قوموں کے سپرد ہوتی ہے جو اس کا حق ادا اور اس کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں، اس کا سب سے بڑا حق بلا امتیاز ملک کے ہر باشندے کے ساتھ عدل و انصاف ہے، جب تک حق ادا ہوتا رہے گا حکومت بھی باقی رہے گی ورنہ واپس لے لی جائے گی، عدل کا لازمی نتیجہ سکون و اطمینان، امن و خوش حالی اور ترقی ہے اور بے انصافی کا، بے اطمینانی، بدنظمی، انتشار، بدامنی اور تباہی، اس لیے دنیاوی حیثیت سے بھی حکومت کی بقا اور ترقی کا مدار بھی عدل ہی پر ہے، حکومت کو دنیا کے موجودہ انقلابات سے سبق حاصل کرنا چاہیے، اس لیے آئینی جمہوریت کو حقیقی جمہوریت بنانا حکومت کا اور اس کی کامیابی کے لیے مدد کرنا ہر محب وطن کا فرض ہے"۔ (۴۸)

بابری مسجد : ۱۹۴۹ء میں بابری مسجد میں مورتی رکھی گئی اور پھر اسے متنازعہ کہہ کر اس میں تالا لگادیا گیا، نماز پر پابندی عاید کردی گئی، اس صریح ظلم و زیادتی کے خلاف مسلمانوں نے احتجاج کیا اور سیکولر حکومت سے مسجد کی حیثیت بحال کرنے کی مانگ کی، اس احتجاج و مطالبے کی تائید شاہ صاحب نے بھی کی، شاہ صاحب کا خیال تھا کہ اس سے مسجدوں کو مندر بنانے کا ایک سلسلہ چل پڑے گا، ان کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ ایک مسجد کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ ملک و ملت کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے، وہ لکھتے ہیں:

"بابری مسجد کے معاملہ میں حکومت بڑی بے توجہی سے کام لے رہی ہے، مسلمانوں کے مسلسل احتجاج کے باوجود اب تک اس نے کوئی توجہ نہیں کی، اگر اس معاملہ میں اس نے غفلت برتی تو کوئی بھی مسجد محفوظ نہ رہ جائے گی اور مسجدوں کو مندر بنانے کا دروازہ کھل جائے گا، یہ صرف ایک مسجد کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک اصول کا سوال ہے کہ ایک سیکولر حکومت میں کسی فرقہ کی

عبادت گاہیں کہاں تک محفوظ ہیں، اگر بابری مسجد مسلمانوں کو واپس نہ کی گئی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مذہب محفوظ نہیں ہے، اس کے بعد حکومت کس منہ سے دنیا کے سامنے اپنے غیر مذہبی ہونے کا دعویٰ کر سکے گی، اگر الکشن کے مصالح کے بنا پر حکومت نے اس معاملہ میں کمزوری دکھائی تو فرقہ پرست اس کو لے ڈوبیں گے"۔ (۴۹)

شاہ صاحب نے کان پور کی مسجد کی مثال دے کر حکومت کو آگاہ کیا کہ یہ مسئلہ ابھی بھولا نہیں ہوگا کہ محض مسجد کے غسل خانے کو لے کر ملک میں اس سرے سے اس سرے تک ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تھا، مسلمانوں کے جذبات ابھی تک وہی ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"کان پور کی مسجد کا واقعہ جو صرف ایک غسل خانے کا معاملہ تھا، ابھی تک بھولا نہ ہوگا، مذہب کے معاملہ میں آج بھی مسلمانوں کے جذبات وہی ہیں اور مسلمان کیا کوئی فرقہ بھی اس طرح اپنی عبادت گاہ کی توہین گوارا نہیں کرسکتا اور نہ اس کی ایک چپہ زمین چھوڑ سکتا ہے، تاہم مسلمانوں کو حکومت کے اعتماد پر اس وقت تک صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے، جب تک اس سے مایوسی نہ ہوجائے"۔ (۵۰)

لیکن آہ! مسلمانوں کے صبر وتحمل اور حکومت پر اعتماد کے باوجود ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد نہ صرف شہید کردی گئی بلکہ اس پر عارضی مندر بھی تعمیر کردیا گیا۔

کانگریس، فرقہ پرستی اور فرقہ وارانہ فسادات: آزادی کے بعد ہندو فرقہ پرستی میں زبردست اضافہ ہوا جس کے سبب ملک میں جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات ہونے لگے، چوں کہ حکومت کانگریس کی تھی اور کانگریس کو سیکولر خیال کیا جاتا تھا اور تمام قوم پرور مسلمانوں کو اس سے بڑی توقعات تھیں لیکن وہ اس پر کھری نہیں اتری، اس نے اگرچہ ملک کو جمہوری قرار دیا اور تمام فرقوں کو مساوی حقوق آئین کے ذریعہ دیے مگر وہ خود ان کا نفاذ عمل میں نہ لاسکی۔

دوسرے قوم پرور اور محب وطن مسلمانوں کی طرح شاہ صاحب نے بھی کانگریس کو بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور اس کے جنون سے آگاہ کیا اور اس کے تدارک کی تدبیریں بھی پیش کیں لیکن یہ تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور کانگریس کے عہد حکومت میں فرقہ پرست اور مسلم دشمن طاقتیں اپنی سرگرمیوں میں پوری طرح مسلمانوں کو نشانہ بناتی رہیں، فسادات کا لامتناہی سلسلہ چل پڑا، اردو زبان ختم کی گئی، بابری مسجد میں مورتیاں رکھی گئیں اور وہ تمام کام ہوتے رہے جو فرقہ پرست

چاہتے تھے، شاہ صاحب کا خیال ہے کہ یہ سب اس لیے ہوا کہ خود کانگریس عملاً ایک فرقہ پرست ادارہ بن گئی تھی، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے کانگریس نے انہیں بالکل نظر انداز کردیا اور ان کی ایک شکایت بھی دور نہیں کی بلکہ ان کو ان کے جائز حقوق سے بھی محروم کردیا، ان کی زبان اور ان کی تہذیب مٹانے کی کوشش کی فرقہ پرور جماعتوں کو ان کے مقابلہ میں بالکل آزاد چھوڑ دیا"۔ (۵۱)

کانگریس کی یہ بے حسی اور فرقہ پروری آزادی کے فوراً بعد ہی شروع ہوگئی تھی، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد سے اس کو اخلاق وتہذیب اور انسانیت وشرافت سے بھی آزادی مل گئی ہے، خصوصاً مسلمانوں کے معاملہ میں کسی کی زبان وقلم پر کوئی احتساب نہیں رہ گیا ہے، جس کی زبان میں جو آتا ہے کہہ گذرتا ہے، اس وقت ہندوستان کے مسلمان جن مشکلات میں مبتلا ہیں اور امتحان وآزمایش کے جن حالات سے گزر رہے ہیں وہی کیا کم ہیں کہ فرقہ پرستوں نے ان کی دل آزاری کے لیے ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کی تحقیر وتذلیل شروع کردی ہے، ادھر عرصہ سے کتابوں، مضامین اور تقریروں میں علانیہ ان کے خلاف زہر اگلا جارہا ہے مگر اس کی کوئی باز پرس نہیں کی جاتی ...... آخر حکومت کب تک مسلمانوں کی توہین وتحقیر کا تماشا دیکھتی اور ان کے صبر وتحمل کا امتحان لیتی رہے گی، اس کو کچھ تو اپنی سیکولرزم کی لاج رکھنا چاہیے"۔ (۵۲)

کانگریس کی کمزوری کا حال ملاحظہ ہو، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"حکومت کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اس نے فرقہ پروروں کو پوری آزادی دے رکھا ہے، وہ جس طرح چاہیں اقلیتوں کی جان، مال اور عزت وآبرو سے کھیلیں، فرقہ پرست جماعتیں ان کے لیڈر، ان کے اخبارات علانیہ فرقہ پروری کی آگ بھڑکاتے اور اقلیتوں کے جذبات مجروح کرتے ہیں اور حکومت خاموش تماشا دیکھتی رہتی ہے"۔ (۵۳)

اس ظلم وزیادتی کے اسباب بیان کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ حکومت اور کانگریس دونوں میں اکثریت فرقہ پرستوں کی ہے، اس لیے زبان سے تو فرقہ پرستی کی مذمت کی جاتی ہے لیکن اس کے انسداد کی عملی کوشش نہیں ہوتی جو دو چار

سچے کانگریسی رہ گئے ہیں اور دل سے فرقہ پرستی کا خاتمہ چاہتے ہیں ان کی آواز کا کوئی اثر نہیں ہے اور وہ بھی اکثریت کے خوف سے فرقہ پرستی کے خلاف عملی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتے لیکن اگر جمہوریت اور سیکولرزم کا دعوی دھوکا نہیں اور حکومت ملک میں امن و امان اور دنیا کی نگاہوں میں جمہوریت کا بھرم قایم رکھنا چاہتی ہے تو اس کو ایک نہ ایک دن کھل کر فرقہ پرستی کا سامنا کرنا پڑے گا اور بالآخر جیت اسی کی ہوگی کہ حق بہر حال باطل پر غالب آکر رہتا ہے، ورنہ محض زبانی دعوی کی کوئی قدر و قیمت نہیں"۔ (۵۴)

فرقہ پرستوں نے مسلمانوں پر یہ الزام عاید کیا کہ انہوں نے آزادی کی جنگ میں اپنا مکمل کردار ادا نہیں کیا، اس کے بہانے سے انہوں نے مسلمانوں کے جذبہ حب الوطنی کو بھی نشانہ بنانا شروع کیا تو شاہ صاحب نے جگہ جگہ اس کی تردید کی اور بتایا کہ مسلمانوں نے نہ صرف جنگ آزادی میں قربانیاں دی ہیں بلکہ انہوں نے ہندوستان پر گوناگوں احسانات بھی کیے ہیں۔

شاہ صاحب نے فسادات کے سد باب کے لیے بڑی مفید تجویزیں پیش کی ہیں اور نہایت زریں مشورے بھی دیے ہیں، دراصل ان کے شذرات سے فرقہ وارانہ فسادات کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

حواشی

(۱) ڈاکٹر آدم شیخ، شاہ معین الدین احمد ندوی علم و حلم و فضل کی شمع فروزاں، ص ۱۴۳، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی ۲۰۰۱ (۲) شذرات ماہ نامہ معارف، جنوری ۱۹۴۸، ص ۲ (۳) ایضاً جون ۱۹۴۹، ص ۴۰۳ (۴) ایضاً جنوری ۱۹۵۲، ص ۲-۳ (۵) ایضاً نومبر ۱۹۷۰، ص ۳۲۲ (۶) ایضاً (۷) ایضاً مئی ۱۹۷۰، ص ۳۲۴ (۸) ایضاً مارچ ۱۹۴۹، ص ۱۶۲ (۹) ایضاً اگست ۱۹۵۶، ص ۸۲ (۱۰) ایضاً مئی ۱۹۵۶، ص ۳۲۳-۳۲۴ (۱۱) ایضاً اگست ۱۹۵۸، ص ۸۴ (۱۲) ایضاً فروری ۱۹۵۵، ص ۸۳ (۱۳) ایضاً اگست ۱۹۵۹، ص ۱۸۳ (۱۴) ایضاً جون ۱۹۶۰، ص ۴۰۲ (۱۵) ایضاً مارچ ۱۹۶۳، ص ۱۶۲-۱۶۳ (۱۶) ایضاً مئی ۱۹۵۲، ص ۳۲۲-۳۲۳ (۱۷) ایضاً جنوری ۱۹۵۱، ص ۲-۳ (۱۸) ایضاً ۱۹۵۲، ص ۴ (۱۹) ایضاً (۲۰) ایضاً نومبر ۱۹۶۵، ص ۳۲۲ (۲۱) ایضاً ستمبر ۱۹۵۶، ص ۱۶۲-۱۶۳ (۲۲) ایضاً دسمبر ۱۹۵۸، ص ۴۰۲-۴۰۳ (۲۳) ایضاً ص ۴۰۴ (۲۴) ایضاً اگست ۱۹۵۶، ص ۸۴ (۲۵) ایضاً اکتوبر ۱۹۶۰، ص ۲۴۳ (۲۶) تعمیر حیات، شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر ص ۱۷

(۲۷) شذرات معارف مارچ ۱۹۴۴، ص ۱۶۲ (۲۸) ایضاً (۲۹) ایضاً نومبر ۱۹۵۹، ص ۳۲۵ (۳۰) ایضاً اکتوبر ۱۹۵۹، ص ۲۴۴ (۳۱) ایضاً دسمبر ۱۹۶۲، ص ۴۰۳ (۳۲) ایضاً ستمبر ۱۹۶۴، ص ۱۶۴ (۳۳) ایضاً مئی ۱۹۵۶، ص ۳۲۳ (۳۴) ایضاً جنوری ۱۹۴۹، ص ۲ (۳۵) ایضاً مئی ۱۹۷۰، ص ۳۲۴ (۳۶) ایضاً جنوری ۱۹۴۹، ص ۲ (۳۷) ایضاً ص ۳ (۳۸) ایضاً مارچ ۱۹۴۹، ص ۱۶۳ (۳۹) ایضاً مئی ۱۹۶۱، ص ۳۲۴ (۴۰) ایضاً مئی ۱۹۵۲، ص ۳۲۴ (۴۱) ایضاً مئی ۱۹۴۴، ص ۳۲۳ (۴۲) ایضاً ستمبر ۱۹۷۱، ص ۱۶۳ (۴۳) ایضاً فروری ۱۹۵۹، ص ۸۴ (۴۴) ایضاً دسمبر ۱۹۵۵، ص ۴۰۴ (۴۵) ایضاً (۴۶) ایضاً (۴۷) ایضاً جون ۱۹۶۰، ص ۴۰۳ (۴۸) ایضاً ۱۹۵۰، ص ۸۲ (۴۹) ایضاً فروری ۱۹۵۰، ص ۸۲ (۵۰) ایضاً (۵۱) ایضاً مارچ ۱۹۶۷، ص ۱۶۴ (۵۲) ایضاً ستمبر ۱۹۵۴، ص ۱۶۲ (۵۳) ایضاً اکتوبر ۱۹۶۱، ص ۲۴۲-۲۴۳ (۵۴) ایضاً مئی ۱۹۵۹، ص ۳۲۲

✿✿✿✿✿
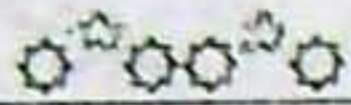
مولانا ابوالکلام آزاد

(مذہبی افکار، صحافت اور قومی جدوجہد)

از:- ضیاء الدین اصلاحی

اس کتاب میں پہلے سورۂ فاتحہ کی اہمیت و جامعیت، حمد کا مفہوم اور لفظ اللہ کی حقیقت اور اس کا مفہوم بیان کیا گیا ہے پھر سورہ فاتحہ میں بیان کردہ صفات الٰہی، ربوبیت، رحمت اور عدالت کے متعلق مولانا آزاد کے افکار و خیالات اور تصورات پر مفصل اور دل آویز بحث کی گئی ہے، صفت ربوبیت کی توضیح میں ربوبیت الٰہی کے مظاہر، نظام ربوبیت، نظام پرورش، عناصر حیات کی کارفرمائیوں وغیرہ کے متعلق مولانا کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے، رحمت کے ذیل میں رحمت کا مفہوم، رحمٰن و رحیم کا فرق، نسب و صبر اور توبہ و انابت کی تشریح کی گئی ہے، عدالت کے ذیل میں دین کے معنی، مالک یوم الدین کی حقیقت اور عدالت الٰہی کا اعلان، وضع میزان وغیرہ کی وضاحت و ترجمانی کی گئی ہے، دوسرے حصے میں مولانا آزاد کی ادارت میں نکلنے والے رسایل و جراید میں نیرنگ عالم، المصباح، احسن الاخبار، خدنگ نظر، لسان الصدق، الندوہ، البلاغ، الہلال، پیغام، اقدام، الجامعہ، ثقافۃ الہند وغیرہ کا تفصیل سے جایزہ لیا گیا ہے اور آخر میں قومی جدوجہد میں مولانا کی خدمات اور ان کے حصے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ قیمت: ۱۱۰/روپے

اخبار علمیہ

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کو پوری دنیا بالخصوص یورپ میں بالکل صحیح، مستند، تحقیق شدہ اور حرف آخر سمجھا جاتا ہے مگر ہائی گیٹ جونیئر اسکول لندن کے ایک بارہ سالہ طالب علم لوسین جارج نے اس کے کچھ اغلاط کی نشان دہی کی ہے، اس نوخیز طالب علم کو جس کا پسندیدہ موضوع مرکزی یورپ اور جنگلی یا آدی واسی زندگی ہے، انسائیکلو پیڈیا کے اڈیٹر نے شکریے کا خط لکھا ہے، لوسین جارج ہفتہ میں متعدد گھنٹے انسائیکلو پیڈیا کے مطالعہ میں صرف کرتا ہے اور اب تک اس کی ۳۲ جلدیں پڑھ چکا ہے، انسائیکلو پیڈیا کے مطابق عثمانیوں اور پولس کے درمیان لڑی جانے والی جنگیں چاٹن کے قصبہ مالدوا میں لڑی گئی تھیں لیکن طالب علم کی تحقیق میں یہ جنگیں مالدوا کے بجائے یوکرین میں ہوئی تھیں، اس نے مزید چار تسامحات کی نشان دہی کی ہے۔

امریکی خلائی گاڑی ''ہائجنس'' سے ملنے والی تازہ ترین تصویروں سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ سیارہ ''ٹائٹن'' پر موجود آب شاروں، ندیوں اور جھیلوں میں ''میتھن'' گیس موجود ہے، محققین نے متعدد ایسے شواہد اکٹھا کیے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ''ٹائیٹن'' پر زمین کی طرح کئی ماحولیاتی یا موسمی حادثات ہوئے ہیں، ان تصویروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ٹائیٹن'' کی سطح پر بارش کے سبب، پتلی پتلی درار کی شکل کی نالیاں ہیں اور برسات کی وجہ سے اس کی مٹی ڈھلان کی طرف بہ گئی ہے، اس ضمن میں مارٹی تمسکو نے بتایا کہ اس سیارے پر سیال قسم کے مادے (میتھن) کی موجودگی سے وہاں کی ندیوں اور پہاڑوں کو سمجھنے اور ان سے واقفیت حاصل کرنے میں مدد مل سکتی ہے، ان تمام شواہد اور قیاسات سے سائنس دانوں نے یہ رائے قایم کی ہے کہ سورج سے سب سے زیادہ فیض یاب ہونے والے اس چاند نما سیارے پر موسمی حادثات و انقلابات جاری ہیں اور اس کی سطح پر بعض جگہ معمولی سیال اور روغنی مادے مشاہدے میں آئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہاں لمبے عرصہ سے بارش نہیں ہوئی ہے، ان کی تحقیق کے مطابق ''ہائجنس'' ٹائیٹن کے جس علاقہ میں اترا ہے وہ بے آب و گیاہ ہے جس کی ندیاں خشک ہوگئی ہیں۔

شمالی مصر کے مشہور علاقہ میں جاپانی ماہرین آثار قدیمہ کو لکڑی کا ایک تابوت ملا ہے، جس میں

۳۵۰۰ برس پرانی لاش ہے، یہ محققین کے خیال میں کسی مرد حکمراں کی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس قبل مسیح تخت سلطنت پر متمکن تھا، تابوت پیلے رنگ کا ہے اور لاش کے چہرے پر سرخ اور نیلے رنگ کا نقاب ہے۔

میگزین دی ایسٹرو فزیکل میں ایک رپورٹ شایع ہوئی ہے کہ ماہرین علم فلکیات نے آفتاب سے ساڑھے تین سو گنا زیادہ چمکنے والے ''ریگلس'' نامی سیارے کا پتہ لگایا ہے، سائنس دانوں نے اس عظیم سیارے کے حجم، سایز، رفتار اور درجۂ حرارت کا جایزہ لے کر خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کا درجۂ حرارت سورج سے بہت زیادہ ہے، اسی لیے یہ اس سے بہت زیادہ روشن اور تاباں ہے، جارجیا گورنمنٹ یونی ورسٹی کے محققین کہتے ہیں کہ انہوں نے انتہائی طاقت ور دوربین سے ''ریگلس'' کے بارے میں یہ واقفیت حاصل کی ہے، اسے "CHARA" کی سائنسی کوششوں کا نتیجہ مانا جارہا ہے، نظام شمسی کے تمام سیارے اپنے مدار پر گھوم رہے ہیں اور سورج ۴۵۰۰-میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ۲۴ دن میں ایک چکر پورا کرتا ہے لیکن ''ریگلس'' سات لاکھ میل کا عظیم سفر ایک گھنٹہ میں طے کرلیتا ہے، اس کا حجم سورج کے حجم سے پانچ گنا زیادہ ہے، چوں کہ ریگلس میں اپنے مرکز سے باہر کی جانب پھینکنے کی قوت زیادہ ہوتی ہے، اس لیے اس کے چکر کا دایرہ اس کے اصل حجم سے بڑا ہے، اسے ''پراسرار مقناطیسی'' سیارہ بھی کہہ سکتے ہیں، سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق اس کا درجۂ حرارت ۱۰- سے ۱۵- ہزار سلسیش ہے، اس کی سطح بہت گرم ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ سورج سے ۳۵۰ گنا زیادہ روشن نظر آنے والا سیارہ ہے۔

آسٹریلیا کی یونی ورسٹی آف کوینز لینڈ میں شعبہ انجینیرنگ کے ایک لیکچرر بل کلارک ہیں، انہوں نے گلے سڑے کیلے کے چھلکوں سے بجلی پیدا کرنے کا نہایت کامیاب تجربہ کیا ہے، رپورٹ کے مطابق ضایع ہوجانے والے کیلوں سے جو بجلی پیدا ہوگی وہ پانچ سو مکانوں کے لیے کافی ہوگی، آسٹریلیا کی بنانا گروز کونسل نے کلارک سے جب اس مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا تو انہوں نے کہا کہ کوئنز لینڈ میں سالانہ دس ہزار ٹن کیلا پیدا ہوتا ہے جن کا صرف ایک تہائی حصہ استعمال ہوتا ہے اور بقیہ سڑگل کر ضایع ہوجاتا ہے، حالاں کہ یہ ایندھن پیدا کرنے کا ذریعہ ہوسکتے ہیں لیکن یہ نہایت دقت طلب اور دشوار کام ہے کیوں کہ تھوڑی سی بجلی پیدا کرنے کے لیے کیلوں کے بہت بڑے ڈھیر کی ضرورت ہوگی، ان کے مطابق بجلی سے چلنے والے فین ہیٹر کو تیس گھنٹوں تک چلانے کے لیے

۶۰-کلوگرام کیلے کے چھلکے درکار ہوں گے۔

ناسا کے ایک ماحولیاتی سراغ رساں سیارچہ ''میرا'' نے ایک چونکا دینے والی خبر یہ دی ہے کہ ہندوستان کے صوبہ بہار کے آسمان میں امریکی شہر لاس اینجلس سے پانچ گنا زیادہ آلودگی ہے جو صحت اور موسم کے لیے مضر ہے، اس سربستہ راز کا انکشاف آلودگی سے متعلق چار سالہ تحقیقات سے ہوا جو ناسا کے ''ارتھ آبزرویٹنگ سسٹم'' کے پروگرام کے تحت MIRS کے ذریعہ کرائی گئیں، ان تحقیقات سے معلوم ہوا کہ صوبہ بہار کے سر پر پورے ہندوستان سے زیادہ کثیف آب و ہوا اور آلودگی ہے، محققین نے گنگا کے کنارے ۱۰-کرور گھنی آبادی والے اس علاقے میں اس قدر آلودگی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہاں کھانا پکانے اور متعدد دوسری ضرورتوں میں استعمال کیے جانے والے ایندھن سے دھوئیں اور آلودگی کا اخراج زیادہ ہوتا ہے۔

۱۵/اکتوبر ۱۹۹۷ء کو ناسا اور اٹالین اسپیس ایجنسی کے مشترکہ پروجیکٹ کے تحت جو پیغام رساں سیارچہ بوکیپ کناویرل (جرمنی) سے روانہ کیا گیا تھا وہ زحل کی سطح پر اترنے میں کامیاب ہوگیا، اس سے متعلق حاصل شدہ ابتدائی معلومات سے سائنس دانوں کو یقین ہوگیا ہے کہ اس کے آلات ابھی تک ناکارہ نہیں ہوئے ہیں، وہ اپنا کام پوری طرح کرنے میں مصروف ہیں، سات سال کے طویل عرصہ کے بعد اس اطلاع سے سائنس دانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن اس پروجیکٹ کے خاص محقق ساؤتھ ووڈ کا کہنا ہے کہ ہمیں اس مہم کو اس وقت تک مکمل طور پر کامیاب نہیں سمجھنا چاہیے، جب تک کہ ''کاسینی'' کی معرفت پیغام موصول نہ ہوجائے، سائنس دانوں کو اس بات کا یقین ہے کہ زحل زمین سے کافی مشابہ ہے لیکن فی الحقیقت اس کی سطح پر کیا کیا اور کس قسم کی اشیا ہیں، یہ سب عقدے ابھی تک لاینحل ہیں، ڈچ ماہر علم نجوم ''کرسٹن ہیگنس'' کے نام سے یہ سیارچہ منسوب کیا گیا ہے، اس کا خصوصی کیمرہ سطح زحل پر موجودہ اشیا کی بہ آسانی تصویر کشی کرسکتا ہے، کچھ تصویروں کی وصول یابی کے بعد ہی وہاں کے ماحولیات کے رازوں سے پردہ اٹھ سکے گا، خلائی ماہرین کو توقع ہے کہ اس مہم کی کامیابی سے اس کا پتہ چل جائے گا کہ زمین پر زندگی کا آغاز کب ہوا تھا۔

ک۔ ص اصلاحی

٭٭٭

معارف کی ڈاک

احادیث عاشورا

بمہور، اعظم گڈھ

۳۰/جنوری ۲۰۰۵ء

محترم و مکرم جناب مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

معارف بابت ماہ ستمبر تا دسمبر ۲۰۰۴ء میں ڈاکٹر محمد یسٰین مظہر صدیقی صاحب کا ایک مفصل مضمون ''احادیث عاشورا : ایک درایتی تجزیہ'' کے عنوان سے شایع ہوا ہے، جس کے لیے وہ اور آپ مبارک باد کے مستحق ہیں، فاضل مضمون نگار نے اس عام غلط فہمی کے ازالے کے لیے قوی دلایل فراہم کردیے ہیں کہ تشریع احکام و مسایل میں موافقت یا مخالفتِ اہل کتاب کوئی بنیادی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ضمنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ مخالفتِ اہل کتاب کے اسی مزعومہ کے سبب عالمِ عرب میں اور بالخصوص مصر میں داڑھی ترشوانے کا عمل مسلمانوں میں رائج ہے اور اس کے جواز میں یہی بات کہی جاتی ہے کہ چوں کہ یہود داڑھی رکھتے ہیں، اس لیے ہم کو ان کی مخالفت کرنی چاہیے۔

اس مضمون سے مستشرقین کے اس غلط پروپیگنڈہ کی بھی نفی ہوجاتی ہے کہ بحیرا راہب، حنفاے عرب یا یہود مدینہ کی نقالی میں اسلامی احکام و مسایل وضع کیے گئے۔

ناچیز راقم دو باتوں کی طرف مقالہ نگار کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے، اول یہ کہ محض دس محرم کے روزہ کی کراہت یا عدم کراہت کے متعلق متقدمین کے اقوال کا مزید احاطہ کرنے کی ضرورت تھی، ثانیاً احادیث کے مطالعہ کے ساتھ قرآن مجید میں وارد آیاتِ صوم کو بھی زیر بحث لانے کی ضرورت تھی، اس موضوع پر میں نے آپ کا ایک مقالہ آپ کی کتاب ''ایضاح القرآن'' مطبوعہ کراچی میں دیکھا ہے جس میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کے حوالہ سے عاشورا کے روزہ کی

فرضیت آیت قرآنی سے ثابت کی گئی ہے۔

فاضل مقالہ نگار سے مودبانہ درخواست ہے کہ وہ تحویل قبلہ کے عنوان سے بھی کوئی جامع وبسوط مقالہ معارف میں سپرد قلم فرمائیں تاکہ ہم بے بضاعت طالب علموں کی رہنمائی ہو[1]۔

والسلام، طالب دعا

محمد عارف عمری

بزم مشاعرہ

''موتا'' ہاؤس نمبر 64-12-1

محلہ گھاٹی اورنگ آباد۔431001

محترمی! السلام علیکم۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے، شہر اورنگ آباد کے چار سو سالہ جشن کے موقع پر دلرس سوسایٹی اورنگ آباد کی جانب سے ایک یادگاری مجلہ شایع کیا جارہا ہے۔ جس میں اورنگ آباد کے تعلق سے مختلف موضوعات پر مضامین ہوں گے، اس سلسلے میں مجھے انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد کی جانب سے ۱۹۲۸ء میں شایع کردہ ایک کتاب ''بزم مشاعرہ'' کی ضرورت ہے۔ جس میں مہاراجہ سرکشن پرشاد کے زیر صدارت اورنگ آباد میں ہونے والے ایک مشاعرے کا احوال ہے، شاید یہ کتاب آپ کی لائبریری میں ہو، آپ سے درخواست ہے کہ براہ کرم اس تعلق سے مطلع فرمائیں تاکہ کتاب کا زیراکس حاصل کیا جاسکے[2]۔

فقط

آپ کا نیاز مند

عنایت علی

---

[1] معارف: یہ مقالہ واقعی بہت محنت و تحقیق سے لکھا گیا تھا اور لایق تحسین ہے، گو اس کے بعض نکات سے اہل علم کو اختلاف ہوسکتا ہے، افسوس ہے کہ اس علمی مقالے کی اشاعت پر ہم کو بعض عتاب نامے بھی ملے ہیں جن میں فی الواقع نہ کوئی بات ہے نہ دلیل، بس غصہ اور برہمی، جس کی وجہ یہی ہے کہ لوگ تن آسانی کی بنا پر علمی، تحقیقی اور سنجیدہ چیزیں پڑھنے اور محنت و مطالعہ کے عادی نہیں رہ گئے ہیں، البتہ مضمون نگار ان مباحث کو اور سمیٹ کر لکھتے تو طول بیان اور اطناب سے محفوظ رہتے۔ ''ض'' [2] یہ کتاب دارالمصنفین کے کتب خانے میں تو نہیں ہے لیکن اگر کسی کے پاس ہو تو مکتوب نگار کے پتے پر بھیجنے کی زحمت فرمائیں۔ ''ض''

وفیات

جسٹس خواجہ محمد یوسف

سخت افسوس ہے کہ جسٹس خواجہ محمد یوسف ۹؍ دسمبر ۲۰۰۴ء کو میڈی ویو نرسنگ ہوم میں وفات پاگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ کلکتہ کے بہت محبوب اور ہر دل عزیز شخص تھے، مہینوں سے موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار تھے، چند ماہ قبل برلا ہارٹ ریسرچ سنٹر میں ان کے دل کا آپریشن ہوا تھا، اس کے بعد ہی سے کچھ نہ کچھ تکلیف رہتی تھی، انتقال سے پندرہ روز پہلے بیماری بڑھ گئی تو نرسنگ ہوم میں داخل ہوئے، ڈاکٹروں کی نگرانی میں امبولنس اور اسٹریچر پر تھوڑی دیر کے لیے ایران سوسایٹی میں تشریف لائے جہاں ۸؍ دسمبر کو ان کے بڑے صاحب زادے خواجہ جاوید یوسف کی شادی ہورہی تھی اور نکاح ہوتے ہی نرسنگ ہوم واپس چلے گئے، ۹؍ دسمبر کی صبح کو اچانک طبیعت زیادہ خراب ہوگئی مگر دوپہر تک سنبھل گئی تو کھانا تناول فرمایا اور سوگئے، شام کو پھر طبیعت خراب ہوئی اور ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی مالک حقیقی سے جاملے۔

میت گھر پر آئی تو تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا، دوسرے دن غسل اور کفن کے بعد دیدار کے لیے جسد خاکی گھر سے متصل اسکول کے ہال میں رکھا گیا تو خلقت ٹوٹ پڑی اور جمعہ بعد جب جنازہ ایک نمبر گوبرا قبرستان لے جانے کے لیے اٹھا تو اس کے ساتھ مسلمانوں کے تمام طبقوں کے علاوہ سکھ، عیسائی، پارسی، ہندو اور بنگالی ہر مذہب وملت کا اژدحام تھا جو زبان حال سے کہہ رہا تھا

چل ساتھ کہ حسرت دل محروم سے نکلے　　عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

خواجہ صاحب کی موت ملک وملت خصوصاً کلکتہ اور مغربی بنگال کے مسلمانوں کے لیے بڑا دردانگیز سانحہ ہے، ان کا وجود ان کے لیے رحمت و نعمت تھا، اس کے چھن جانے پر آج تک وہ سوگوار اور اشک بار ہیں، یہ ممتاز و ماہر قانون داں اس کا سزاوار ہے کہ اس کے غم میں نہ آنسو تھمیں

اور نہ شور گریہ کم ہو، یہ دردمند، دوراندیش اور صایب الرائے مستحق ہے کہ سینہ افلاک سے بھی آہ سوزناک اٹھے اور بطن گیتی سے بھی نالہ شرربار اٹھے۔

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

آہ! قوم وملت کے نازک اور پیچیدہ مسایل کی گتھیاں سلجھانے والا نہیں رہا، وہ جاں نثار چلا گیا جو اپنی خدمات قوم کو نچھاور کر رہا تھا، وہ غم گسار رخصت ہو گیا جو سب کے غم کو اپنا غم سمجھ کر سینہ سپر رہتا تھا، بنگال کا وہ مسیحا نفس باقی نہیں رہا جو اس میں روح حیات پھونک رہا تھا، وہ روشن خیال اور عالی دماغ مصلح دنیا سے اٹھ گیا جو کلکتہ کے مسلمانوں میں تعلیمی بے داری لا رہا تھا اور ان کی معاشرتی، سماجی، معاشی اور ذہنی ودماغی اصلاح وتربیت کے لیے فکرمند اور سرگرم رہتا تھا، اس کے مرجانے سے قوم یتیم ہوگئی، کلکتہ اجڑ گیا اور مغربی بنگال میں سناٹا چھا گیا۔

گلشن میں کہیں بوے دم ساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

خواجہ صاحب ستمبر ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۵۷ء میں قانون کے پیشہ سے وابستہ ہوئے، پہلے کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی، حکومت مغربی بنگال نے ان کی قانونی مہارت اور اعلا ذہنی ودماغی قابلیت دیکھ کر انہیں جلد ہی گورنمنٹ ایڈوکیٹ بنادیا اور ۱۹۸۷ء میں کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا، ۱۹۹۲ء میں سبک دوش ہونے پر بھی انہیں چھٹی نہیں ملی، وکیل اور جج کی حیثیت سے انہوں نے جو غیر معمولی کارنامے انجام دیے ان کی بنا پر ریٹائرڈ ہوتے ہی حکومت نے ۱۹۹۲ء میں ان کو یوسف کمیشن آف انکوایری کا چیرمین نامزد کیا، اس کی رپورٹ مکمل کر چکے تو تری پورہ گورنمنٹ نے انہیں دو کمیشنوں کا سربراہ مقرر کردیا، اسی درمیان حکومت مغربی بنگال نے ۱۹۹۹ء میں وہاں کے اقلیتی کمیشن کا چیرمین بھی بنادیا۔

خواجہ محمد یوسف غیر معمولی دل ودماغ کے آدمی تھے اور ان میں بڑی قوت عمل تھی، وہ کلکتہ اور بنگال ہی نہیں ملک کے بھی متعدد سرکاری وغیر سرکاری، قومی، ملی، اصلاحی، فلاحی اور علمی وتعلیمی اداروں سے منسلک رہے، ویسٹ بنگال فیڈریشن آف یونائیٹیڈ ایسوسی ایشن اور اے - آر قدوائی مدرسہ ایجوکیشن کمیٹی کے نایب صدر، ہندعرب سوسایٹی، ایران سوسایٹی، انجمن مفید الاسلام اور ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ کے صدر، گھلو انسٹی ٹیوٹ اور غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے ٹرسٹی، علی گڑھ

مسلم یونی ورسٹی اور بردوان یونی ورسٹی کورٹ اور جامعہ ہمدرد کے ممبر، انڈین میوزیم کولکاتا، مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز کے بورڈ آف ٹرسٹی کے مرکزی حکومت کے نامزد کردہ رکن، مغربی بنگال اردو اکیڈمی اور مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ کے تاسیسی رکن تھے۔

خواجہ صاحب کا سب سے زیادہ گہرا تعلق ایران سوسایٹی سے تھا، اسے وہ بہت عزیز رکھتے تھے، اس بین الاقوامی ادارے کے اصل بانی ڈاکٹر محمد اسحاق تھے جو ایک شہرۂ آفاق شخص تھے، خواجہ صاحب نے اس کا پرچم سرنگوں نہیں ہونے دیا، اس کا اعلا معیار اور اس کی بین الاقوامی ساکھ قایم رکھنے کے لیے جان کی بازی لگادی اور نئے حالات کے لحاظ سے اسے بڑی ترقی دی، اپنے رفیق کار اور سوسایٹی کے جنرل سکریٹری جناب ایم - اے مجید صاحب کے اشتراک سے اس میں چار چاند لگادیا اور اسے ایک خود کفیل ادارہ بنادیا، اس کے آرگن ''انڈوایرانیکا'' کی ادارت وہ بڑی خوبی اور سلیقے سے انجام دیتے تھے، اس کے اداریے نہایت محنت وجاں فشانی سے لکھتے تھے، ان کی سربراہی میں ایران سوسایٹی نے فارسی زبان وادب کو فروغ دینے کے ساتھ ہی قومی یک جہتی اور سیکولر رجحانات کی اشاعت بھی کی اور ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور بنگالی کلچر کے تحفظ کا سامان بھی کیا، ان کو فارسی زبان سے عشق تھا، سوسایٹی کے وسیلے سے انہوں نے اس زبان کی لازوال خدمت کی، یہاں اکثر سمینار کراتے، ان میں اور دوسری تقریبات میں ملک وبیرون ملک اور خصوصاً ایران کے فضلا اور دانش وروں اور وہاں کے وزرا اور سفرا کو مدعو کرتے، خواجہ صاحب نے اپنے خلوص ومحنت سے سوسایٹی کو اتنا کارگزار اور متحرک اور ایسا باوقار ادارہ بنادیا تھا کہ ہر شخص یہاں آنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

خواجہ صاحب ایک اعلا درجے کے قانون داں تھے، مسلم پرسنل لا میں اختصاص رکھتے تھے، قانون کے میدان میں ان کا جوہر خوب چمکا، وکیل کی حیثیت سے بھی کام یاب اور نیک نام تھے اور جج کی حیثیت سے بے لاگ فیصلے کرتے تھے، اس پیشے میں ہمیشہ دیانت داری اور ایمان داری کو اپنا شیوہ بنایا، جب ایک خبیث اور بدباطن شخص چاندمل چوپڑا نے ہائی کورٹ میں قرآن مجید پر پابندی عاید کرنے کا مقدمہ دایر کیا تو بایاں محاذ کی حکومت نے ان کی اور جنرل سوہانشو اچاریہ کی مدد سے اس کو کامیابی کے ساتھ لڑ کر خارج کرادیا، یہ مقدمہ بڑی اہمیت کا حامل اور پوری دنیا کا

مرکز توجہ ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے خواجہ صاحب کی شہرت اسلامی دنیا تک جا پہنچی تھی، چشم دید لوگوں کا بیان ہے کہ ان دنوں ان پر جذب کی کیفیت طاری تھی، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے بس قرآن ہی کا ذکر کرتے ع ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں - لگتا تھا کہ باریک قانونی نکات ان پر غیب سے القا ہو رہے ہیں، اس کے بعد ہائی کورٹ کے جج ہوئے تو عدل و انصاف کا ترازو ہمیشہ بلند رکھا اور معرکہ آرا فیصلے کر کے دھوم مچادی۔

وہ دو ٹرم اقلیتی کمیشن کے چیرمین رہے، اس حیثیت سے بھی ان کی خدمات گونا گوں اور اہم ہیں، انہوں نے اقلیتوں بالخصوص مسلم اقلیت کے لیے حق و انصاف حاصل کرنے پر پوری توجہ دی اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کا تدارک کیا اور بہت سے الجھے مسئلے سلجھا دیے، انہیں حل کرنے کے لیے مفید اور مناسب سفارشات پیش کیں، قبرستان، اذان اور وقف بورڈ کے بارے میں ان کے سنجیدہ خیالات اور مخلصانہ رائے کا وزن حکومت اور خود مسلم حلقوں نے بھی تسلیم کیا، ان کی ایمان داری اور غیر جانب داری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اقلیتی کمیشن کے چیرمین کی حیثیت سے ان کا دور بڑا شاندار اور یادگار رہا، انہوں نے یوسف کمیشن تری پورہ کے دو انکوائری کمیشنوں کے سربراہ کی حیثیت سے بھی اپنا فرض نہایت ذمہ داری اور ایمان داری سے انجام دے کر اچھا اثر قایم کیا۔

خواجہ صاحب کو مسلمانوں کی سماجی اصلاح اور ان کی دینی، تہذیبی اور ملی شناخت کے بقا وتحفظ کا ہمیشہ خیال رہا، وہ ان کا وزن اور وقار بڑھانے اور ان میں تعلیمی بیداری لانے کے لیے بہت سرگرم رہتے، انگریزی میں برابر اور اردو میں کبھی کبھی اس کے لیے مضامین لکھتے، انگریزی پر ان کو بڑی دست رس اور مکمل عبور تھا، اردو بھی اچھی اور شگفتہ لکھتے تھے، جن تعلیمی اداروں سے ان کا تعلق تھا ان کا معیار تعلیم بلند کرنے کے لیے برابر جدوجہد کرتے تھے اور ان کے کارکنوں کے اختلافات کو دور کرانے کی سعی بھی فرماتے تھے، جن یونی ورسٹیوں کے کورٹ کے ممبر تھے ان کے طلبہ کو سہولتیں بہم پہنچانے اور اساتذہ و ملازمین کی پریشانیاں دور کرنے کی طرف ذمہ داروں کی توجہ مبذول کراتے، اکثر یونی ورسٹیوں کے سربراہوں اور علمی و تعلیمی اشخاص سے ان کے تعلقات تھے، یہ لوگ جب کلکتہ آتے تو خواجہ صاحب ان سے ملاقات کرتے اور انہیں ایران سوسایٹی میں

مدعو کرتے، ان کے اعزاز میں جلسے کرتے، تعلیمی امور سے متعلق گفتگو اور تقریر کے ضمن میں یونی ورسٹی کے مسایل اور بالخصوص مشرقی شعبوں کی خراب حالت کو درست کرنے کی ترغیب دلاتے، مدرسہ تعلیم پر قدوائی کمیٹی کے وائس چیرمین کی حیثیت سے خواجہ صاحب نے رپورٹ اور سفارشات تیار کرنے میں بڑی محنت و جاں فشانی سے کام لیا۔

خواجہ صاحب کو دارالمصنفین سے بھی محبت تھی، اس کے ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے، وہ انہیں "پیارے پیارے خواجہ صاحب" کہا کرتے تھے، ان کی کشش سے عرصہ ہوا وہ ایک بار دارالمصنفین تشریف لائے تو مجھے بھی نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا، صباح الدین صاحب ایران سوسایٹی کے سمیناروں میں برابر تشریف لے جاتے تھے، اگر کسی اور پروگرام سے بھی جانا ہوتا تو خواجہ صاحب انہیں ایران سوسایٹی میں ضرور مدعو کرتے، دو ایک بار مجھے بھی ان کے ہم راہ ایران سوسایٹی کے جلسے میں جانے کا اتفاق ہوا، ان کے انتقال کے بعد میں ایک بار مسلم پروگریسیو سوسایٹی کی دعوت پر کلکتہ گیا اور گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں قیام کیا تو سوسایٹی کے اعزازی سکریٹری جناب زین العابدین سے کہا کہ جناب احمد سعید ملیح آبادی اڈیٹر آزاد ہند کو میرے آنے کی اطلاع کر دیں، اگر وہ اپنے گھر بلائیں تو مجھے ان سے ملا دیجیے، ملیح آبادی صاحب نے خواجہ صاحب اور مغربی بنگال حکومت کے وزیر جناب کلیم الدین شمس صاحب کو بھی میری آمد کی خبر کر دی چنانچہ سب سے پہلے خواجہ صاحب تشریف لائے اور مختلف مسایل پر بڑی دل چسپ گفتگو فرماتے رہے، تھوڑی دیر کے بعد وہ یہ کہتے کہ ابھی تک احمد سعید صاحب کا ورود مسعود نہیں ہوا، یکا یک گھڑی پر ان کی نظر پڑی تو کہنے لگے اب میں چلتا ہوں، مجھے کورٹ جانا ہے، آپ ایران سوسایٹی کب آرہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ میرے پاس کوئی وقت نہیں بچا، انہیں بڑا افسوس ہوا اور افسوس کرتے ہوئے چلے گئے، ان کے جانے کے بعد ملیح آبادی صاحب اور شمس صاحب نے کرم فرمایا اور دونوں کو بڑا املال ہوا کہ ہم لوگ خواجہ صاحب کی موجودگی میں نہیں آسکے۔

دوسری دفعہ مرحوم ڈاکٹر مقبول احمد صاحب کے یہاں اپنے علاج کے لیے گیا تو انہوں نے مجھ سے ملانے کے لیے احمد سعید صاحب کو ایک وقت کھانے پر بلایا، احمد سعید صاحب نے

خواجہ صاحب کو اطلاع کردی، خواجہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا کہ میں تین بجے تیار رہوں، وہ کسی کو بھیج کر مجھے ایران سوسایٹی لے جائیں گے، چنانچہ اردو کے مشہور شاعر اور اہل قلم الحاج علقمہ شبلی صاحب کو مجھے لینے کے لیے بھیجا، وہاں پہنچا تو ایک جلسہ اور پر تکلف عصرانے کا اہتمام تھا، یہ علقمہ شبلی صاحب وہی ہیں جن کو خواجہ صاحب نے اپنے جنازے کی نماز پڑھانے کی وصیت کی تھی۔

صباح الدین صاحب کے انتقال کے بعد ان سے گہرے تعلق اور علمی اداروں سے خواجہ صاحب کے شغف کو دیکھ کر میں نے ان کا نام دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت کے لیے پیش کیا جسے مجلس نے منظور کرلیا اور خواجہ صاحب کی منظوری بھی آگئی، مگر یہ وہی زمانہ تھا جب وہ یوسف انکوایری اور تری پورہ انکوایری کمیشنوں میں بہت مشغول رہتے تھے، چنانچہ جس زمانے میں یہاں جلسے کی تاریخیں مقرر کی جاتی تھیں اسی زمانے میں ان کے کمیشنوں کی تاریخیں بھی ہوتی تھیں اس لیے وہ خطوط لکھ کر نہ آنے کی معذرت کردیتے اور آخر میں بہت افسوس کے ساتھ استعفا دے دیا۔

خواجہ صاحب دین دار اور صوفی منش شخص تھے، بزرگانِ دین سے ان کو بڑی عقیدت تھی، صوم وصلاۃ کے پابند اور متبع سنت تھے، سنت کی پیروی کی وجہ سے کسی مسلمان کی دعوت مسترد نہ کرتے، عبادت سمجھ کر اپنے فرائض اور ذمہ داریاں بڑی ایمان داری سے انجام دیتے، ان میں بڑی دینی وایمانی حمیت بھی تھی، اسی بنا پر قرآن مجید کا مقدمہ بڑی دل چسپی سے لڑا، اس کے باوجود وہ روشن خیال اور سیکولر ذہن رکھتے تھے، دوسرے مذاہب کا بڑا احترام کرتے تھے، مسلم مسائل میں ان کا رویہ حقیقت پسندانہ ہوتا تھا، وہ کہتے تھے ہمارے نوجوان اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں تو ملازمت اور عہدہ چل کر ان کے پاس آئے گا۔

خواجہ صاحب کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ان میں ہر مذہب ومشرب کے لوگ شامل تھے، وہ صرف مسلمانوں کی تقریبات ہی میں شریک نہیں ہوتے بلکہ ہندو، سکھ، پارسی اور عیسائی ہر ایک کے یہاں کی تقریب کی رونق بڑھاتے تھے، علمی، دینی، ادبی اور قومی جلسوں کی طرح دکانوں کے افتتاح اور پوجا پنڈال میں بھی پہنچ جاتے اور اپنے کو ہر مجلس میں فٹ کرلیتے، جلسہ کسی طرح کا ہو، ہر ایک میں اپنی خطابت کا جادو جگاتے، مقرر بہت اچھے تھے، جب تقریر شروع کرتے

تو مجمع پر سکون ہوجاتا اور لوگ محویت واستغراق سے ان کی باتیں سنتے تھے۔

وہ بڑے مرنجاں مرنج شخص تھے، اس لیے ہر طبقے اور ہر فرقہ ومذہب کے لوگوں میں مقبول ومحبوب تھے، ان کی پوری زندگی خدمت خلق میں بسر ہوئی، اس معاملے میں مذہب وملت کی تفریق نہ کرتے، ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے، ان کا تعلق کسی سیاسی ومذہبی جماعت سے نہیں تھا مگر ہر جماعت ان پر اعتماد کرتی اور ان کا احترام کرتی، حکام رس تھے اور حکومت میں بڑا اثر ورسوخ رکھتے تھے، مغربی بنگال کے وزرا اور وہاں کے اکثر گورنروں سے ان کے اچھے مراسم تھے اور اس طرح بھی وہ اپنی قوم اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے کام آتے، انسان دوستی، حسن خلق، فیض رسانی، اخوت، محبت، مروت اور ملن ساری ان کی سرشت میں داخل تھی۔

اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں بھی ان کے درجات بلند کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی میں ۲۹ رنومبر ۲۰۰۴ء کو علامہ شبلیؒ سمینار کا چوتھا اجلاس ہورہا تھا کہ یہ افسوس ناک خبر ملی کہ جید عالم اور اردو کے محقق، نقاد اور ادیب جناب نثار احمد فاروقی ۲۷ و ۲۸ ر نومبر کی درمیانی شب میں انتقال کرگئے انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کی لاش دہلی سے امروہہ لائی گئی اور ۲۸ رنومبر کو اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کردیے گئے۔

وہ بڑے صحت مند تھے مگر پچھلے کئی برس سے طبیعت خراب رہنے لگی تھی، گزشتہ سال جنوری کے آخر میں ان کے گھر ملاقات کے لیے گیا تو مجھے بہت مضمحل معلوم ہوئے، دریافت کرنے پر بتایا کہ رات ہی بمبئی سے آیا ہوں، وسط مارچ میں رام پور رضا لائبریری کے سمینار میں ملے تب بھی کچھ سست اور بجھے بجھے دکھائی دیے تاہم ان کی تقریر اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے، دلی سے ان کا جاننے والا کوئی آتا تو وہ بھی ان کی علالت کا ذکر کرتا، دارالمصنفین کے سمینار میں اسی لیے شروع میں ان کو زحمت دینے میں تامل ہورہا تھا مگر ان کو مجھ سے اور دارالمصنفین سے جو لگاؤ تھا، اس کی وجہ سے طبیعت نہ مانی اور دعوت نامہ بھیج دیا، اسی دوران اخباروں میں پڑھا کہ وہ پروفیسر

گوپی چند نارنگ کے ہم راہ دوحہ (قطر) ایوارڈ لینے گئے ہیں، اس لیے ایک عزیز کو دستی خط دے کر اصرار کیا کہ آپ تشریف لاکر مفتخر فرمائیں، خطوط کا جواب وہ فوراً دیتے تھے مگر اس دفعہ کسی خط کا جواب نہیں آیا، جب سمینار میں دہلی اور دوسری جگہوں سے لوگ آنے لگے تو جناب شعیب اعظمی نے جو بٹلہ ہاؤس میں ان کے قریب ہی میں رہتے ہیں بتایا کہ وہ سخت بیمار ہیں، آنے کے لائق نہیں ہیں، آخر یہ جاں گسل اطلاع آہی گئی، اسی وقت دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھ گئے، بعض لوگوں نے تاثراتی تقریریں کیں اور تعزیتی قرارداد منظور کی گئی

زندگی انسان کی ہے مانند مرغ خوش نوا — شاخ پر بیٹھا، کوئی دم چہچہایا، اڑ گیا

نثار احمد فاروقی ۲۹ رجون ۱۹۳۴ء کو امروہہ کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے تھے، ان کا سلسلہ نسب بابا فرید گنج شکرؒ سے ہوتا ہوا امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ تک جا پہنچتا ہے، یہ خاندان پہلے پنجاب میں آباد ہوا، فیروز شاہ تغلق نے مراد آباد کا یہ وسیع علاقہ بابا صاحب کی اولاد کو بہ طور معافی دیا تھا، دنیاوی وجاہت کے ساتھ یہ خاندان صوفی مشرب اور طریقت میں ممتاز تھا، مولانا نسیم احمد فریدی نثار صاحب کے حقیقی چچا اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کے پھوپھی زاد بھائی تھے مگر نثار صاحب کو شروع میں مشکل اور صبر آزما دور سے گزرنا پڑا، کم عمری میں والد کے فاتر العقل ہونے کی وجہ سے ان کی اور ان کے دوسرے بھائی بہنوں کی پرورش ان کے نانا شاہ سلیمان احمد چشتی نے کی، ان ہی سے فارسی اور عربی شروع کی، پھر حیدر آباد اور امروہہ کے مدارس میں زیر تعلیم رہے، گردش روزگار نے دہلی پہنچا دیا، پہلے صحافت کے پیشے سے وابستہ ہوئے پھر دہلی یونی ورسٹی کی لائبریری میں ملازمت ملی، کچھ آسودگی نصیب ہوئی تو حصول علم کا داعیہ موجزن ہوگیا، پہلے ہائی اسکول اور انٹر کے امتحانات پاس کیے، پھر اور مشرقی و مغربی امتحانات دے کر یونی ورسٹی کے شعبہ عربی میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے اور پروفیسر اور کئی بار صدر شعبہ ہو کر وظیفہ یاب ہوئے۔

ذہانت کے ساتھ وہ بڑے محنتی تھے اس لیے راہیں خود بہ خود کھلتی گئیں، مطالعہ کا شوق تو تھا ہی، دلی یونی ورسٹی کی لائبریری کے اردو سیکشن کے انچارج ہوئے تو سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں اور ہزاروں کے نام سے واقف ہوگئے، اس کی وجہ سے ان کی علمی استعداد اپنے ہم سروں سے بہت بڑھی ہوئی تھی، ان کے استحضار، کثرت علم و مطالعہ اور وسیع معلومات کی بنا پر طالب علمی ہی

کے زمانے سے ان کے دوست احباب انہیں "علامہ" کہنے لگے تھے، رسمی تعلیم منقطع ہونے کے بعد بھی وہ برابر پڑھتے لکھتے اور علم کے شیدائی بنے رہے اور زندگی کے کسی موڑ پر بھی ان کی کدوکاوش، تلاش و جستجو اور تحقیق و تدقیق کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

علم کی دیوانگی نے ان کو آرام و راحت سے بے نیاز کر دیا تھا اور پڑھنا لکھنا ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگیا تھا، ان کا قلم برابر رواں دواں رہتا اور کبھی رکنے کا نام نہ لیتا، ان کی مضمون نگاری کی ابتدا بچپن ہی میں ہوگئی تھی اور انہوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن کی وجہ سے وہ جلد ہی اہل علم کا مرکز توجہ بن گئے، وہ اردو فارسی، عربی اور انگریزی پر اچھی دست رس رکھتے تھے اور ہندی سے بھی واقف تھے، طبع زاد تصانیف کے علاوہ کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے، ادب، تحقیق، تنقید، تاریخ، سیر، تذکرہ، مذہبی علوم اور تصوف میں زندگی بھر ان کا قلم گل کاریاں کرتا رہا، ان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مختلف ادبی دھاروں سے الگ رہ کر اپنی دنیا آپ پیدا کرتے رہے۔

اصلا ان کا کام اردو میں ہے اور اس میں ادب و تصوف اور تاریخ و سیر سے ان کا خاص لگاؤ تھا، ان کی تصنیفات سے ان کے بلند ادبی ذوق اور تحقیقی و تنقیدی ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے، اردو شاعری کے اساطین میرؔ، غالبؔ اور مصحفیؔ پر ان کا کام بڑی اہمیت کا حامل ہے، سب سے پہلے انہوں نے ذکر میرؔ کا اردو ترجمہ کیا جو ۱۹۵۷ء میں میرؔ کی آپ بیتی کے نام سے شائع ہوا، اس میں یہ انکشاف کیا ہے کہ ذکر میر سراج الدین علی خاں آرزو کی "چراغ ہدایت" کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اور میر کے عہد کی ایک بیاض سے ثابت کیا ہے کہ ع "کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو" میرؔ ہی کے اشعار ہیں، ۱۹۶۳ء میں جب وہ ایم۔اے کر رہے تھے تو دلی کالج کا ضخیم میرؔ نمبر ان کی ادارت میں نکلا اور بعد میں اپنے مضامین کا مجموعہ "تلاش میرؔ" کے نام سے شائع کیا۔

غالبیات ان کی تحقیق و کاوش کا خاص محور تھا "تلاش غالب" ان کی مشہور کتاب ہے، اس میں غالب کے خطوط اور تحریروں سے ان کی سوانح عمری مرتب کی ہے اور غالب کے بعض غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل کیے ہیں، ایک خط سرسید مرحوم کے نام بھی ہے، غالب سے متعلق لکھے گئے مضامین کا اشاریہ "غالب نما" کے نام سے مرتب کیا، دیوان غالب نسخہ امروہہ کی تدوین بیاض غالب کے نام

سے کی، اسے دیوان غالب کی اولین روایت کہا جاتا ہے جسے توفیق احمد امروہوی نے بھوپال سے دریافت کیا تھا، نثار صاحب نے مالک رام صاحب کی ذکر غالب کا ہندی ترجمہ بھی کیا تھا۔

اردو کے مشہور زود گو اور قادر الکلام شاعر میر غلام ہمدانی مصحفی کی کلیات دیوان اول و دوم شایع کرکے ان سے ہم وطنی کا حق ادا کیا، اس میں متن کی صحت کا بڑا خیال رکھا ہے اور مشکل الفاظ کے معانی بھی لکھے ہیں، مقدمہ میں ان کے سوانح، شاعرانہ کمالات اور تلامذہ کے حالات دیے ہیں، شعرائے اردو کے تذکروں پر بھی ان کا کام اہمیت رکھتا ہے، ان کا مرتب کردہ تذکرہ قدرت اللہ شوق مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۶۶ء میں شایع کیا، ۱۹۶۸ء میں اس کی اور گل رعنا اور مجمع الانتخاب کی تلخیص تین تذکرے کے نام سے دہلی سے شایع کیا، اپنے مضامین میں ایک درجن سے زیادہ تذکروں کا تعارف کرایا۔

تصوف تو ان کے گھر کی چیز تھی، ان کے نانا ایک بزرگ صوفی اور سجادہ نشین تھے، ان کی پاکیزہ زندگی دیکھ کر انہیں تصوف سے بڑی رغبت ہوگئی تھی اور اس کی مخالفت میں ایک لفظ سننا پسند نہیں کرتے تھے، اس کا مطالعہ بڑی دقت نظر سے کیا تھا، ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کو جدید انداز میں پیش کرکے اس کی قدر و قیمت اور معنویت دکھائی ہے، ''نقد ملفوظات'' اور ''چشتی تعلیمات اور عصر حاضر میں ان کی معنویت'' اور ''تذکرہ خواجہ معین الدین چشتی'' اسی نوعیت کی کتابیں ہیں، انہوں نے تصوف کی قدیم کتابوں کو عصری رنگ اور اسلوب میں پیش کیا ہے، اس سلسلے میں فارسی متون کی تدوین اور ایڈیٹنگ کی اور ان پر محققانہ مقدمے لکھے جیسے مولانا تھانوی کی امداد المشتاق اور مرقومات امدادیہ، تذکرہ روضۃ الاولیا (غلام علی آزاد) قوام العقاید (خواجہ نظام الدین اولیا کے حالات) مقاصد العارفین (عضد الدین جعفری چشتی) تذکرہ مقالات الشعرا (قیام الدین حیرت اکبرآبادی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

خواجہ نظام الدین اولیا اور ان کے سلسلے سے ان کو بڑا شغف تھا، ان کے اور دوسرے صوفیہ کی سیرت وسوانح اور تعلیمات پر انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے، ''منادی'' کا کوئی شمارہ ان کے مضامین سے خالی نہیں ہوتا تھا، صوفیہ کے پیغام کو عام کرنے کے لیے ان کے عرس میں سمینار کرانے کی روایت قایم کی۔

فارسی کی کئی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا جیسے شاہ عبدالہادی کے مجموعہ ملفوظات ''مفتاح الخزائن'' (سید نثار علی بریلوی) میاں نور محمد چشتی کا مجموعہ ملفوظات ''خلاصۃ الفوائد'' ملفوظات خواجہ زین الدین شیرازی ''ہدایت القلوب'' مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ شاہ غلام علی نقشبندی کے ملفوظات ''در المعارف'' و رسالہ وحدت الوجود ''یقظۃ النائمین'' (شاہ حامد ہرگامی) اور تاج الدین محمود کے فارسی رسالہ غایۃ الامکان فی درایۃ المکان کا انگریزی ترجمہ کیا۔

عربی زبان میں ان کی خدمات بھی قابل قدر ہیں، دلی یونی ورسٹی کے شعبہ عربی کے مدتوں سربراہ رہے اور انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے عربی رسالہ ثقافۃ الہند کے برسوں اڈیٹر رہے، آزاد بلگرامی کی عربی کتاب ''شفاء العلیل'' کا متن ایڈٹ کرکے شایع کیا، ڈاکٹر جواد علی کی کتاب کا اردو ترجمہ تاریخ طبری کے مآخذ کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ کے نام سے کیا، ایک مختصر رسالہ ''اہمیۃ السیرۃ الطیبہ للعالم البشری'' کے نام سے لکھا جس کا اردو ترجمہ ''عالم بشریت کے لیے سیرت طیبہ کی اہمیت'' کے نام سے کیا، آنحضرتؐ کے منتخب مکتوبات کا اردو ترجمہ کیا۔

ان کے علمی وتحقیقی بعض مجموعہ مقالات کا ذکر پہلے آچکا ہے ''دید و دریافت'' اور ''دراسات'' کے نام سے بھی مجموعے چھپے، ہندی میں ذکر غالب کے علاوہ مولوی عبدالحق کی چند ہم عصر کا ترجمہ کیا۔

ان کی گوناگوں علمی خدمات کا بڑا اعتراف کیا گیا، ان کی کتابوں پر مختلف اداروں اور اردو اکیڈمیوں نے ایوارڈ دیے، دہلی اردو اکیڈمی نے ان کی مجموعی ادبی خدمات پر ایوارڈ دیا، عربی زبان کی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۵ء میں انہیں صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا اور سب سے آخر میں گوپی چند نارنگ نے بزم ادب دوحہ (قطر) کا ایوارڈ دلایا، مختلف یونی ورسٹیوں کے اکزامنر اور ان کی ڈین فیکلٹیوں اور متعدد اداروں اور کمیٹیوں کے ممبر رہے۔

نثار صاحب نے اپنے بارے میں خود لکھا ہے کہ وہ عہدوں کے حصول کے لیے کبھی سرگرداں نہیں رہے، خوددار تھے، خود بینی اور خود نمائی، خوشامد، تملق، سخن سازی، ریشہ دوانی اور مطلب برآری کے لیے داؤں پیچ کے فن سے نا آشنا تھے، لگی لپٹی بات نہیں کرتے، صاف گوئی سے کام لیتے تاہم مغلوب الغضب اور تنگ مزاج تھے، بہت جلد برہم ہوجاتے تھے، اسی لیے اپنے

دوستوں سے اکثر ان کی ان بن ہو جاتی تھی، کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں اپنے قصبے اور دلی میں مسلمان گھرانوں کی جو حالت دیکھی تھی، اس کی تلخی ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر گئی تھی، اس کی وجہ سے مزاج میں حدت آگئی تھی، گو بہ ظاہر کٹھور معلوم ہوتے تھے مگر اندر سے نرم تھے۔

انہیں دوسروں کا کام کر کے اور لوگوں کی مدد کر کے خوشی ہوتی تھی اور جب کسی کو پریشانی میں دیکھ کر اس کی مدد کرنے میں بے بس رہتے تو انہیں بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی، ان کے دریائے علم کا بہاؤ کبھی رکتا نہیں تھا اور سب کے لیے ان کا فیض عام رہتا تھا، طالب علموں کی رہنمائی کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیتے، تھیسس لکھنے میں ان کی پوری معاونت کرتے، مذہب و مسلک کے معاملے میں زیادہ متشدد نہ تھے، ہر مسلک و مشرب کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، صوفیہ سے ان کو زیادہ عقیدت و شیفتگی تھی، اپنے تجربے کی بنا پر کہتے تھے کہ "انسان دوستی، دردمندی، حسن اخلاق، بے طمعی، پاکیزگی فکر اور اطمینان قلب صرف ایک سچے درویش کے پاس ہوتا ہے، باقی لوگ اس سے محروم ہیں، اس لیے خوار ہوتے ہیں"، نثار صاحب کا عقیدہ، مسلک اور عمل جو بھی رہا ہو، عام ادیبوں کی طرح وہ اپنے مذہب و ملت سے کبھی بے زار اور برگشتہ نہیں رہے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمتِ کاملہ سے نوازے، آمین۔

آہ! پروفیسر عتیق احمد صدیقی

۱۷؍ دسمبر کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے داعی اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کا وطن دیوبند تھا، ان کی تعلیم دوسرے اداروں میں ہوئی تھی لیکن علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں مرحوم کے عاشق تھے، ان دونوں کی کشش انہیں علی گڑھ کھینچ لائی اور یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے اور ترقی کر کے پروفیسر، صدر شعبہ اردو اور آرٹس فیکلٹی کے ڈین ہوئے، وہ سرسید ہال کے پرووسٹ بھی رہے، سرسید اکیڈمی کے اڈیٹر کی حیثیت سے ان پر بعض سمینار کرائے، ایک سمینار میں مجھے بھی شرکت کا موقع بخشا، جامعہ اردو کے

نایب شیخ الجامعہ ہو کر اسے بڑا فیض پہنچایا۔

عتیق صاحب نے سودا کے قصاید پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی، ان کی مرتب کردہ اور ترجمہ کی ہوئی کتابوں کے نام یہ ہیں:

انتخاب مضامین سرسید، بازیافت، مراسلات سرسید، انتخاب الٰہی بخش معروف، انتخاب مضامین زمین دار، اشاریہ تنقید، مولانا سید سلیمان ندوی (سمینار میں پڑھے گئے مضامین کا مجموعہ)، اسلام اور امن عالم، اسلام اکیسویں صدی میں، آخری دونوں کتابیں ترجمہ ہیں۔

قدرت نے مرحوم کو دردمند دل اور دینی مزاج عطا کیا تھا، نماز جماعت سے ادا کرتے، اپنی مسجد کے امام بھی تھے، قوم کی فلاح و بہبود اور مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے بڑے آرزومند تھے، ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد علم و تعلیم کے فروغ اور اصلاحِ معاشرت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، رابطہ کمیٹی یو-پی کے اہم عہدہ داروں میں تھے، اس کے معاشرتی اور تعلیمی کارواں کے ساتھ ملک کے اکثر علاقوں کا دورہ کیا، ایک بار یہ کارواں جناب سید حامد کی قیادت میں اور دوسری بار ان کی قیادت میں اعظم گڈھ آیا تو انہوں نے دارالمصنفین میں قیام کیا، اس وقت ان کے نیک احساسات و خیالات، حسن خلق و عمل، اصول پسندی، فرض شناسی، مرتب اور صاف ستھری زندگی کا پورا اندازہ ہوا۔

عتیق صاحب بڑے وجیہ، سلیقہ مند، جامہ زیب اور کشیدہ قامت تھے، تقریر موثر اور ٹو دی پوائنٹ کرتے جس میں فضول باتیں اور سخن سازی نہ ہوتی، طبعاً نہایت شریف، خلیق اور بھلے آدمی تھے، مجھے دو ایک بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو بڑے لطف و شفقت سے پیش آئے۔

جمعہ کے دن مغرب کی نماز کے لیے وضو کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آگیا، یہ ان کی مغفوریت و مقبولیت کی دلیل ہے، ان کی وفات سے قوم اپنے ایک مخلص اور بے لوث خادم سے محروم ہوگئی، اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

"ض"

☆☆☆

مطبوعات جدیدہ

شاہ ولی اللہؒ کی خدمات حدیث: از پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۱۶، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی اور حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، پھلت ضلع مظفر نگر، یوپی۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کی جامع کمالات شخصیت میں علم حدیث کا اثر سب سے نمایاں ہے، اس کتاب میں اسی اجمال کی تفصیل ہے، شاہ صاحب کی قریب دس کتابیں تو خالص اسی موضوع سے متعلق ہیں باقی ان کی اور کتابیں اور تحریریں اسی علم شریف سے روشن ہیں، فاضل مصنف نے وسیع مطالعہ اور تحقیقی محنت سے ہر رخ اور گوشے پر نظر کی ہے تاہم اصل بحث شاہ صاحب کی مسوی اور مصفی پر مرکوز ہے، چنانچہ کتاب کے قریب آٹھ ابواب میں تین چوتھائی حصہ ان دونوں شرحوں کے لیے وقف ہے، امام مالک و شاہ صاحب کی محدثانہ شان کے جامع بیان کے بعد جس میں شاہ صاحب کی فکر میں امام مالک کے رجحانات و ترجیحات کے اثرات کی نشان دہی کی گئی ہے، مصفی کے مقدمہ کا خلاصہ اس خوبی سے ہے کہ فقہ حدیث میں شاہ صاحب کے امتیازات کا اظہار پوری طرح ہو گیا لیکن کتاب کی جان موطا مالک کے نسخوں اور روایات کی تحقیق خصوصاً شاہ صاحب کے پیش نظر نسخہ مصمودی کی بحث ہے جس میں مصمودی کے تسامحات اور شاہ صاحب کی تصحیح کا مکمل تنقیدی اور تجزیاتی جایزہ لے کر یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ عددی اعتبار سے شاہ صاحب کی تنقیدوں کی اہمیت خواہ کم ہو لیکن نقد حدیث و رجال کے لحاظ سے ان کی اہمیت بہر حال مسلم ہے جس میں مصمودی کی بیان کردہ اسناد کے ابہام و وہم کو دور کیا گیا ہے، اسی ضمن میں ایک عمدہ بحث شاہ صاحب کے طریق شرح سے متعلق ہے، گو شاہ صاحب کی تحریر سے خود ان کا طریق شرح و تعلیق بڑی حد تک واضح ہے لیکن فاضل مصنف کی نظر میں بعض اہل علم نے شاہ صاحب کے بیان سے اختلاف کیا ہے، یہ پوری بحث موطا امام مالک بلکہ علم حدیث سے اشتغال رکھنے والوں کے لیے بڑی اہم اور بہت مفید ہے، ایک باب تاویل حدیث کے عنوان سے سب سے مفصل ہے اور یہ عام طالبین علم حدیث کے لیے بھی بہت کارآمد ہے، اس قابل قدر کتاب سے علم حدیث میں فاضل مصنف کے وسیع اور عمیق مطالعے کے علاوہ ان کی محدثانہ ژرف نگاہی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، مسوی اور مصفی کے حوالے سے موطا امام مالک کے متعلق اردو میں یہ شاید سب سے عمدہ جایزہ ہے، نقد و محاکمہ میں انصاف سے صرف نظر نہیں کیا گیا، ابن ماجہ کی بعض روایات سے استناد کے متعلق لکھا گیا کہ "حضرت شاہ کے دامن پر دوسرے اصول سازوں کی مانند اپنے اصول پر کاربند نہ

رہنے کی بدنامی کے چھینٹے نظر آتے ہیں" یا یہ کہ نسخہ مصمودی اور دوسرے نسخوں کی مرویات کے باب میں شاہ صاحب نے ترجیح و تعیین کا کام نہیں کیا حالانکہ وہ اپنے نسخہ مصمودی کی روایات کی تعیین کر سکتے تھے، اسی طرح یہ خیال بھی ہے کہ شاہ صاحب فقہ حنفی کو فقہ شافعی و مالکی کے مطابق بنانا چاہتے ہیں مگر فقہ حنفی کی حدیثی اساس کو نظر انداز کر دیتے ہیں، موجودہ دور میں شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات کی تبلیغ میں فاضل مصنف شاید سب سے پیش پیش ہیں، اس لیے عقیدت کی فراوانی کا اثر بھی کہیں کہیں ظاہر ہے، شاہ صاحب کے الہام و القا، رویا و مقام اور روحانی ارشاد و ہدایت کی تائید بلکہ معترضین کی تردید میں ان کے خیالات اس کی مثال ہیں۔

رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی: از جناب چودھری علی مبارک عثمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۲۵۶، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ ندویہ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔

سرشار الست دل والے مست ازل جگر مرادآبادی کے کلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ سادگی اور تکلف کی ہر شان سے بے نیازی کے باوجود اس میں بے حد فطری آرائش اور از خود حسن کی نمائش ہے، جگر کی شاعری آج بھی ادب کے خوش مذاق شیدائیوں کی دنیا میں زندہ ہے مگر ایک احساس یہ بھی ہے کہ جگر کی شاعری کا حسن نقادوں کے حجابات عصبیت میں مستور رہا، جس کا شایان شان تجزیہ اب تک نہ ہو سکا، اس کتاب کے باذوق مرتب نے محسوس کیا کہ جگر کی شخصیت و شاعری پر ایک مکمل کتاب کی ضرورت ہے، اسی خیال کا نتیجہ یہ کتاب ہے جس میں اولاً مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ماہر القادری اور ڈاکٹر سید عبدالباری کی نگارشات اور خود جگر مرحوم کی بعض تحریروں کو سلیقے سے یکجا کیا گیا ہے اور پھر مرتب کے قلم سے ایک مضمون ہے جس میں جگر کی شاعری کے محاسن کے ساتھ بعض مشاہیر معاصر شعرا سے موازنہ کی کوشش کی گئی ہے، نصف کتاب جگر کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے، چند تصویریں بھی ہیں، جگر کی شاعری کی اہمیت و معنویت کو تازہ کرنے کی یہ مبارک کوشش ہے، کتاب میں فہرست کا صفحہ بھی ہونا چاہیے۔

فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس: از جناب وبھوتی نارائن رائے، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی اور دہلی کے دوسرے مکتبات۔

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی تاریخ الزاموں اور جوابی الزاموں سے بھری ہے، ظلم و زیادتی اور رد عمل کے جواز نے ان فسادات کی اصل وجہ کو ہمیشہ پس پشت ہی رکھا، حکومت کے تحت پولیس انتظامیہ کو اگر ایک طبقہ مجرم قرار دیتا رہا تو دوسری جانب غیر اصولی طریقے سے پولیس کی زیادتیوں کو سند

جواز بھی عطا کی جاتی رہی، یہ اتفاق ہے کہ ایک اعلا پولیس آفیسر کو فسادات اور پولیس کے موضوع پر جایزہ لینے کا موقع ملا اور جب یہ عمل مکمل ہوا تو معلوم ہوا کہ جذبہ دیانت وصداقت نے ایسے حقایق بیان کرادیے جن کے اظہار کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، جناب وی این رائے ایک آئی پی ایس افسر ہیں لیکن اس کتاب سے اندازہ ہوا کہ وہ اس سے بڑھ کر انسانی اقدار پر ایمان وعمل میں بھی درجہ بلند پر فایز ہیں، انہوں نے وزارت داخلہ کی رپورٹوں، تحقیقاتی کمیشنوں اور خود پولیس ریکارڈ کے حوالے سے ثابت کیا کہ فسادات میں پولیس ہمیشہ مسلمان دشمن شکل میں نظر آتی ہے، آخر حقایق سے کب تک انکار کیا جائے گا، یہ کتاب اسی سوال کا ایسا جواب ہے کہ اس کی مثال ملنا مشکل ہے، پولیس کے تعصب، ظلم اور جانب داری کی اس فرد جرم نے مظلوموں کو ایک طاقت ور سہارا دیا لیکن اس سے زیادہ اس جایزے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں فرقہ وارانہ فسادات کا تاریخی پس منظر اور فسادات کی نفسیاتی اور سماجی توضیحات کو بڑی عالمانہ ومحققانہ بصیرت سے پیش کیا گیا ہے، ان کے خیال میں "موجودہ دنیا میں فرقہ پرستی، حکم راں طبقے کے ذریعہ اپنی خاص سماجی برتری کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنائی جانے والی سب سے موثر دست اندازی ہے" آخر میں چند سفارشات بھی ہیں اور یہ یقیناً اس لایق ہیں کہ اگر ان پر عمل کیا جائے تو ملک کو فسادات کی لعنت سے نجات مل سکتی ہے، اصل کتاب انگریزی میں تھی اس کا ترجمہ معصوم مرادآبادی نے کیا ہے اور خوب کیا ہے۔

پرستش وعقیدت: از جناب ابرار اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات: ۲۰۰، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: نونہال اکیڈمی، خالص پور، اعظم گڈھ، ۲۷۶۱۳۸۔

حمد ونعت، مناجات ومنقبت پر مشتمل ایک اور مبارک مجموعہ کلام سے اردو کی حمدیہ ونعتیہ شاعری میں پاکیزہ اضافہ ہوا، شاعر کا اصل میدان تعلیمات کا ہے، زندگی درس وتدریس میں گزری، شاعری میں بھی وہ گم نام نہیں، ان کے کلام سے اردو کے اکثر رسایل معمور رہتے ہیں، ایک مجموعہ کلام پہلے بھی شایع ہوچکا ہے، اب حمد ونعت کے ذریعہ ذہن وروح کے اصل جذبات پرستش وعقیدت کے نام سے سامنے آئے، عنوان سے ہی حمد ونعت کے نازک فرق کی وضاحت ہوجاتی ہے، تقریظ مدیر معارف کے قلم سے ہے، کہا گیا ہے کہ "صنایع وبدایع کے استعمال سے اس شاعری کا لطف دوبالا ہوگیا ہے، بعض نظموں میں لفظی ومعنوی صفتوں کا کمال ہے، قدیم طرز کی بجائے بیان میں ندرت وجدت ہے، تخیل بھی انوکھا اور نرالا ہے" اس سند کے بعد کسی اور سند کی ضرورت نہیں، آخری دو شعر علامہ شبلی کے تتبع میں ہیں، خاتمہ بالخیر اور قبولیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے۔

ع - ص